قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوا عَنِّی وَلَوْ آیَۃً

رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

کا

اٹھارواں وعظ مسمّٰی بہ

الدعوۃ الی اللّٰہ

منجملہ ارشادات حضرت قبلہ و کعبہ مرشدی مولانا حافظ شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی دام ظلہم

حسب فرمائش محمد عثمان مالک کتب خانہ اشرفیہ دریبہ کلاں دہلی
آرمی پریس دہلی میں طبع کرایا

ایسا نہیں ہے جس کا نام آج نیا سُنا ہو یہ تو قرآن کا مدلول ہے۔ اور قرآن کے مطالب و معانی آج سے نہیں بلکہ تیرہ سو برس پہلے سے مشہور و معلوم ہیں، جو اہل علم ہیں وہ تو خود ہی خوب جانتے ہیں اور جو غیر اہل علم ہیں وہ بھی ضرورت کے درجہ تک اگرچہ خود نہ ہی تو سنے سنائے جانتے ہیں۔ بہرحال یہ ایسا عمل نہیں جس کی فضیلت ذہنوں سے غائب ہو۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب سب اس مضمون کو جانتے ہیں تو پھر تحصیل حاصل سے کیا فائدہ؟ لیکن اگر اپنا معاملہ اسکے ساتھ دیکھا جائے تو یہ آسانی سے معلوم ہو جائیگا کہ ایسے ضروری مضمون کی طرف سے کسقدر بے توجہی اور لاپروائی کی جا رہی ہے۔ اور اسی لئے ضرورت متوجہ کرنیکی ہوئی۔ اب تحصیل حاصل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور بے توجہی ہمیشہ دو وجہ سے ہوتی ہے یا تو اسکی ضرورت کا علم نہیں ہوتا۔ یا علم تو ہے مگر عمل نہیں ہے۔ سو یہاں غایت سے غایت اگر کوئی کہہ سکتا ہے۔ تو یہ کہہ سکتا ہے کہ علم تو سب کو ہے۔ اس لئے کہ کبھی قرآن سب پڑھتے ہیں۔ اور قرآن ہی کا یہ مضمون ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ قرآن کے پڑھنے سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک درجہ کا علم ہے گو اس علم میں بھی اہل علم و غیر اہل علم کے مدارج میں تفاوت ہوتا ہے۔ تو خیر یہ ضرورت نہ ہوئی اس مضمون کی طرف متوجہ کرنے کی۔ مگر عمل کے متعلق جو اس مضمون کا حصہ ہے وہ تو یقیناً بہت ہی قلیل ضعیف ہے بلکہ قریب قریب معدوم ہے۔ چنانچہ اسکے متعلق اپنی حالت کے دیکھنے سے معلوم ہو جاویگا۔ تو اسلئے تو متوجہ کرنا ضروری ہے۔ اور متوجہ کرنے کا آسان ذریعہ بیان ہے اسلئے بیان کرنا بھی ضروری ہوا۔ اب یہ بات رہ گئی کہ حالت دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ عمل کا حصہ قلیل و معدوم ہے سو ہر شخص اپنی حالت دیکھ لے کہ شب و روز میں سے منٹ اور کتنا وقت اس کام کے لئے اس نے خاص کر رکھا ہے۔ یوں تو ہم میں عابدین بھی ہیں زاہدین بھی ہیں علماء بھی ہیں طلباء بھی ہیں۔ غرض طرح طرح سے دین کی خدمتیں کیجا رہی ہیں۔ اور ان کا اہتمام بھی ہے۔ مگر یہ دیکھ لیں کہ جتنی دیر وظیفہ تلاوت ذکر و شغل اور نفلیں پڑھنے میں صرف کرتے ہیں اور کسب حلال میں (جو بقصد ثواب عبادت ہے)

(الدعوۃ الی اللہ)

الاشتات	المستمعون	من ضبط	من ای شان	لم	ماذا	کیف	کم	متے	این
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ... اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم
بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ ومن احسن قولا ممن دعا الی اللہ وعمل صالحا وقال
اننی من المسلمین ۔ ولا تستوی الحسنۃ ولا السیئۃ ادفع بالتی ھی احسن
فاذا الذی بینک وبینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم ۔ وما یلقاھا الا الذین صبروا
وما یلقاھا الا ذو حظ عظیم ۔ واما ینزغنک من الشیطن نزغ فاستعذ باللہ
انہ ھو السمیع العلیم ۔ یہ چند آیتیں ہیں سورہ حم سجدہ کی انمیں حق سبحانہ تعالیٰ نے
ایک خاص عمل کی فضیلت مع اس کے تکملات و آداب کے ارشاد فرمائی ہے ۔ اور وہ
خاص عمل کونسا ہے ؟ وہ وہ ہے جس کا نام انہی آیات میں دعوۃ الی اللہ رکھا
گیا ہے ۔ دعوۃ الی اللہ کے کیا معنی یعنی حق تعالیٰ کی طرف بلانا ۔ حق تعالیٰ کی طرف
بلانے کا یہ مطلب کہ دین کی طرف بلانا ورنہ کوئی حق تعالیٰ کے سامنے لیجا کے تو کھڑا
کرنے سے رہا تو یہ ہے وہ عمل جس کی فضیلت ان آیات میں ذکر کی گئی ہے ۔ ہر چند یہ عمل

اور سلام سے خوش ہو کر ہم کو روپے دیجاوے۔ کیا اچھا حساب لگایا۔ بس جی اگر ایسی ہی احتمالات ہیں تو بلی کو بھی سلام کیا کرو چوہے کو بھی سلام کیا کرو۔ یہاں تک کہ سُور کو بھی سلام کیا کرو۔ کیونکہ یہ احتمالات تو سب میں مشترک ہیں۔ مگر اپنی شدت طمع کی وجہ سے غریب کو یہ خبر نہ تھی کہ محققین نے لکھا ہے کہ ہر جن کتے کی شکل میں نہیں ہوتا۔ ان میں بھی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک معزز رئیس و امرا۔ یہ شیر ہرن اور دوسرے ہیبت دار یا خوبصورت جانوروں کی شکل بدلتے ہیں۔ اور ایک ہوتے ہیں فقیر مفلس اور معمولی قسم کے وہ کتے بلی چوہے وغیرہ کی شکل بدلتے ہیں کیونکہ کتے کی عادت ہے کہ یہاں کھڑا ہو گیا وہاں کھڑا ہو گیا تو یہ بھک منگے اور کنگلے کے مشابہ ہے۔ اور جو اس قسم کے جن ہوتے ہیں وہ اس کی شکل میں آتے ہیں۔ ورنہ جو امرا ہیں۔ وہ کبھی ایسی رذیل اور ذلیل شکل میں نہیں دکھائی دیتے۔ بہرحال اسکا سلام تو ضائع گیا کہ وہ سمجھا کہ یہ جنوں کا بادشاہ ہوگا۔ تو اسے طمع نے اتنا خراب کیا کہ اس نے کتے کو بھی اس لالچ سے سلام کیا کہ شاید روپے ملجاویں۔ تو یہ طمع ایسی بُری چیز ہے۔ خیر یہ تو اس احمق نے نہایت منکر فعل کیا خدانخواستہ کوئی اور ایسا تو کیوں کرنے لگا مگر تاہم اس طمع کی وجہ سے ایسے افعال سرزد ہو جاتے ہیں۔ جو کسی درجہ میں منکر ضرور ہوتے ہیں اگرچہ بظاہر وہ ناگوار نہ معلوم ہوں۔ چنانچہ عام طور پر یہ بلا پھیلی ہوئی ہے۔ کہ جہاں ذرا بھی توقع ہو وہاں نہی عن المنکر سے اندیشہ ہوتا ہے۔ اور وہم ہوتا ہے۔ کہ ایسا نہ ہو خفا ہو جاوے۔ میں کہتا ہوں کہ تم اپنی طرف سے ایسا طریقہ امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کا نہ نکالو جس سے کوئی خفا ہو جاوے۔ اور اگر تمہارے اچھے طریقے پر بھی کوئی خفا ہو جاوے تو یہ اسکا فعل ہے تمہارا فعل نہیں ہے۔ اب وہ کونسا طریقہ ہے جو اچھا طریقہ ہے۔ اسکے آداب خود حق تعالیٰ نے بیان فرما دیئے ہیں۔ فرماتے ہیں

ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن

بلایئے اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف حکمت کے ساتھ۔ اور نرم نصیحت کے ساتھ اور مناظرہ کیجئے اُن لوگوں سے ایسے طریقہ پر جو اچھا ہو۔ نرم نصیحت کے یہ معنی کہ عنوان اچھا ہو

مشغول ہوتے ہیں آیا اس وقت میں سے کوئی حصہ اس کام میں بھی صرف ہوتا ہے
کہ دوسروں کو حق تعالیٰ کی طرف متوجہ کریں۔ اب فرمائیے ایسے کتنے ہیں جو اس کام کو
کرتے ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاید مہینے کے مہینے خالی جاتے ہیں
جن میں ایک شخص کو بھی متوجہ الی اللہ نہیں کیا جاتا۔ یعنی اس کی نوبت ہی نہیں آتی
کہ کافر کو اسلام کی ترغیب دیں۔ ضعیف الاسلام کو تقویت اسلام کی ترغیب دیں۔
اور جو متردد ہیں جن کے اسلام سے نکل جانے کا اندیشہ ہے انکو اسلام پر ثابت قدم رہنے
کی ترغیب دیں یہ بے توجہی تو اصول کے اعتبار سے ہے۔ اب فروع کے اعتبار سے
بھی دیکھیں تو اس میں بھی وہ کوتاہی نظر آئے گی۔ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر
کا باب ہی مفقود ملیگا۔ امر بالمعروف۔ نیک کام کی ترغیب۔ نماز کی ترغیب جن پر نماز
فرض ہے۔ جن کے پاس بقدر نصاب مال ہے انہیں زکوٰۃ کی ترغیب جن پر حج فرض ہو
انہیں حج کی ترغیب دی ہو۔ یا جنکے اخلاق باطنی اچھے نہوں انکے تہذیب اخلاق
کے طریقے بتلائے ہوں۔ کہ یہ سب دعوۃ الی اللہ ہی کے شعبے ہیں۔ اور امر بالمعروف کے
اقسام ہیں۔ یا کسی کو نہی عن المنکر کیا ہو کسی مبتلائے معصیت کو معصیت سے روکا ہو
خواہ وہ صغیرہ ہو خواہ کبیرہ۔ روکنے کے تو کیا معنی۔ اگر کہیں طمع یا خوف ہو۔ تو اور
اسکی تقریر و تائید کرتے ہیں۔ کہیں دوستوں کے ناراض ہوجانے کا اندیشہ ہوتا ہے
کہیں طمع و توقع کا خیال رہتا ہے۔ کہیں محسنوں کے احسان کا اثر ہوتا ہے۔ بہر حال
طمع میں آدمی بہت ڈھیلا ہو جاتا ہے۔ اور حالت بہت گر جاتی ہے یہاں تک ذلت
و پستی کو اختیار کر لیتا ہے کہ ایسے ایسے موقعوں تک نظر جاتی ہے۔ جہاں دوسروں کا
خیال و وہم بھی نہیں پہونچ سکتا۔ چنانچہ ایک دوست ہیں کانپور کے اپنے ایک
شناسا کی حکایت بیان کرتے تھے۔ کہ اتفاقاً انہوں نے اسکی ہمراہی میں سفر کیا۔
منزل پر پہونچکر دونوں ایک سرائے میں مقیم ہوئے۔ کھانا کھانے بیٹھے اتفاقاً ایک
کتا آیا۔ انہوں نے اسکے دیکھتے ہی کہا السلام علیکم میں نے کہا یہ کیا کہنے لگا۔ کبھی جن
شکل بدل لیتے ہیں۔ تو ممکن ہے یہ جن ہو اور پھر یہ بھی احتمال ہے۔ کہ جنوں کا بادشاہ ہو

یعنی جان اور مال میں تمہاری آزمائشیں ہونگی۔ ولتسمعن الخ اور مشرکین اور اہل کتاب سے اذیت کی باتیں سنوگے۔ اس کی تفسیر میں مفسرین نے بھی واقعہ لکھا ہے۔ کہ وہ اپنے اشعار میں مسلمانوں کی بیویوں کا نام لے لیکے اظہار عشق کرتے تھے۔ اتنی بڑی غیظ و غضب کی بات سننے کے بعد فرماتے ہیں ان تصبروا وتتقوا الخ کہ اگر تم صبر کرو اور بچو (یعنی جہالت کی باتوں سے) تو یہ بڑی عزیمت کی بات ہے اسی طرح ایک اور مقام پر فرماتے ہیں۔ وقل لعبادی یقولوا التی ھی احسن میرے بندوں سے فرما دیجئے کہ وہ نرم بات کہا کریں۔ ان الشیطن ینزغ بینھم شیطان درمیان میں جھڑپ کرنا چاہتا ہے۔ جب جھڑپ اور لڑائی ہوگی۔ تو اُس کا انجام یہ ہوگا کہ دونوں طرف سے عداوت بڑھ جائے گی۔ ان الشیطن کان للانسان عدوا مبینا۔ بیشک شیطان انسان کے لئے کھلا ہوا دشمن ہے۔ تو یہ تو قرآن مجید میں ادب بتایا گیا۔ اب حدیث سنئے کہ سب سے بڑھکر شرارت اور گستاخی اور کفار کی یہ تھی کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی محمدؐ کو مذمم سے بدل لیا تھا۔ اور مذمم کی سخت ہجو کیا کرتے تھے۔ آپ خود ہی اندازہ کر لیجئے کہ ایسے سخت الفاظ سن کے مسلمانوں کا کیا حال ہوتا ہوگا پھر مسلمان بھی ہمارے آپکے سے نہیں بلکہ اسوقت کے مسلمان، مگر قربان جائیے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپ نے ایسی سخت بات کو مسلمانوں کے دلوں سے کیسا ہلکا کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ الا ترون کیف صرف اللہ عنی شتم قریش۔ یعنی دیکھو شتم قریش کو خدا نے مجھ سے کیسے ہٹا دیا۔ یشتمون مذمما ویلعنون مذمما وانا محمد۔ کہ وہ شتم و لعنت کرتے ہیں مذمم پر۔ اور میں تو محمدؐ ہوں۔ تو خدا نے مجھے گستاخی سے کیسا بچا لیا۔ کیونکہ انہوں نے جو برائی کی وہ مذمم کی نام تو حضور کا نہ آیا۔ حضور تو محمدؐ ہیں جو مذمم ہوگا وہ برا مانیگا۔ اگرچہ مذمم سے ارادہ ونیت تو ان کمبختوں کی حضور کی ہی گستاخی کی تھی مگر حضور ہمارے غیظ و غضب کو ہلکا کرنے کے لئے فرماتے ہیں کہ میاں یوں دل کو سمجھا لیا کرو کہ ہمارے حضور کا یہ نام مبارک ہی نہیں۔ بہرحال وہ حق تعالیٰ کی تعلیم تھی۔

اوجمیں دل آزاری ہو۔ طعن وتحقیر ہو اسی طرح مناظرہ میں بھی یہ چیزیں نہایت ضروری ہیں۔ خود جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نمونہ دکھلا دیا۔ اور مناظرہ تو بڑی چیز ہے۔ کیونکہ اس میں دونوں طرف سے علمی ہی بحث ہوتی ہے اور دونوں طرف عالم ہوتے ہیں۔ اس میں جہل کی کیا گنجائش یہ امور تو ایسے واجب الرعایت ہیں۔ کہ اگر کسی جاہل سے بھی سابقہ پڑ جائے تو اسکے جواب میں بھی جہالت کی ممانعت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ واذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلاما اور جبکہ خطاب کرتے ہیں ان سے جاہل تو وہ کہتے ہیں سلام۔ یعنی جاہلوں کی جہالت کا بھی جواب جہالت سے نہیں دیتے۔ باقی یہ کہ یہ کیسے معلوم ہوا کہ جاہلوں کا یہ خطاب جہالت ہی کا ہوگا۔ سو یہاں کے وصف عنوانی سے یہ معلوم ہو گیا۔ کیونکہ خطاب کی صفت یا کیفیت نہیں بیان فرمائی بلکہ خطاب کرنے والوں کی صفت بتادی کہ وہ جاہل ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جب وہ جاہل ہیں تو خطاب بھی جاہلیت ہی کا ہوگا۔ تو یہاں جہالت کی بات کا جواب بھی قالوا سلاما ہے۔ یعنی جہالت کے طریق پر جواب نہیں دیتے۔ اسی طرح اور ایک مقام ہے۔ واقعہ یہ تھا کہ کفار کی گستاخیوں پر مسلمانوں کو شدید غیظ وغضب آتا تھا وہ نامعقول یہ کرتے تھے کہ اپنے اشعار میں مسلمانوں کی بیویوں کا نام لے لیکر اظہار تعشق کرتے تھے۔ اس سے بڑھکر اور کیا گستاخی اور موجب غیظ ہوگا۔ وہ اس حد سے بھی بڑھکر اور بھی ایک گستاخی کرتے تھے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کو بجائے محمد کے مذمم کہتے تھے (نعوذ باللہ) کیونکہ جس طرح محمد کے معنی بہت زیادہ محمود الاخلاق اور ستودہ صفات کے ہیں اسی طرح مذمم کے معنی اس کے مقابلہ میں ہیں۔ نعوذ باللہ۔ خیال تو کیجئے کہ مسلمانوں کو کس قدر ناگوار ہوتا ہوگا کہ جان لینے اور جان دینے کو تیار ہو جاتے ہونگے۔ مگر اتنی بڑی گستاخی اور ایسے سخت موجب غیظ پر حق تعالیٰ کی تعلیم سنئے۔ فرماتے ہیں لتبلون فی اموالکم وانفسکم ولتسمعن من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم ومن الذین اشرکوا اذی کثیرا۔ وان تصبروا وتتقوا فان ذلک من عزم الامور۔ لتبلون الخ

کہ عہدہ دارنے اسے مارا اُس نے کہا کہ آپ اور مار لیجئے۔ مگر میں آپ کو مسجد سے نکلنے نہ دونگا جب تک آپ نماز نہ دوہرائینگے۔ جب شور وغل زیادہ ہوا۔ تو چاروں طرف سے لوگ جمع ہو گئے۔ اور عہدہ دار صاحب سے کہا کہ اس میں اس قدر بُرا ماننے کی کیا بات ہے سچ تو کہتا ہے۔ کیوں نہیں پھر پڑھ لیتے۔ غرض اُس نے اُنہیں نماز پھر پڑھوائی پھر تو ایسی تعدیل سے پڑھی۔ کہ شاید عمر بھر میں یہ اول نماز ہوگی۔ کیونکہ اگر یہ بھی ویسی ہی پڑھتے تو پھر جھگڑا ہوتا۔ جب وہ عہدہ دار نماز پڑھ کے چلے گئے تو اس تاجر کی بستی میں خوب شہرت ہوئی۔ لوگ اسے بزرگ سمجھنے لگے۔ اور جدہر جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں حضرت ذرا یہاں بیٹھ جایئے اور ذرا ہمارے گھر تشریف لے چلیئے۔ اب لوگ ضرورت سے نہیں بلکہ تبرکا عطر خریدتے ہیں داموں میں بھی کچھ تکرار نہیں کرتے کہ اگر زیادہ بھی چلے جائینگے تو برکت ہی ہوگی۔ غرض اس کا سب عطر بھی خوب بکا اور دین کی ایک بات سے دُنیا کا بھی فائدہ ہو گیا۔ غرض اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں کہ اللہ کے لیئے سختیاں برداشت کرتے ہین اور ایک ہم سوال ہیں کہ نہی عن المنکر اس لیئے نہیں کرتے کہ آپس میں ویسا انبساط نہیں رہیگا۔ وہ شگفتگی باقی نہیں رہے گی۔ اذیت کا اندیشہ تو کیا ہوتا محض انشراح کی کمی بھی نہیں چاہتے۔ اور اگر اس خوف کے ساتھ طمع بھی ہو۔ تو پھر کچھ نہ پوچھیئے۔ منع کرنا تو درکنار۔ بلکہ خوشامد کے مارے خود اوس منکر کی الٹی تائید کرتے ہیں۔ اگر امراء میں سے کوئی شطرنج کھیلتا ہو اور کوئی دوسرا اُن کے تو چاہیئے تو یہ تھا کہ یہ خود منع کرتے اور اگر منع کرنے کی ہمت نہ تھی تو خاموش رہتے یہ بھی نہیں بلکہ یہ کہدینگے کہ ہاں امام شافعی رح نے شطرنج کو مباح کہا ہے۔ حالانکہ اب اُنکا بھی یہ قول نہیں رہا۔ اُنہوں نے بھی اس سے رجوع کر لیا ہے۔ اور جب یہ قول تھا تب بھی اس شرط سے تھا کہ اُس میں قمار نہو اور دوسری ضرورتوں میں اسکی وجہ سے خلل نہ واقع ہو۔ آپ کسی شطرنج باز کو دیکھ لیجئے کہ اُسے دُنیا کی کچھ خبر نہین رہتی۔ ضلع سہارنپور کے ایک شاطر کی حکایت ہے۔ کہ اُس کا لڑکا سخت بیمار تھا وہ نزع میں مبتلا ہوا یہ شطرنج میں مبتلا تھا گھر میں سے ماما آئی کہ لڑکے کی بہت بُری حالت ہے

اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے۔ جب جہل کے مقابلہ میں بھی خدا و رسول کو خشونت پسند نہیں تو مناظرہ میں تو کب پسند ہو گی۔ اسی لئے ارشاد ہوا وجادلہم بالتی ھی احسن۔ یعنی مجادلہ ایسے طریقہ پر کرو۔ جو احسن ہو۔ اسلام میں وہ تہذیب ہے کہ اس کے مقابلہ میں کوئی اور قوم نہ تہذیب کا دعویٰ کر سکتی ہے اور نہ کوئی نمونہ پیش کر سکتی ہے۔ تو یہ تہذیب مانع ہے۔ اس سے کہ مناظرہ میں خشونت و دل آزاری کی باتیں ہوں۔ غرض نصیحت میں اپنی طرف سے سختی نہ کرے۔ باوجود اسکے اگر کوئی برا مانے تو مانا کرے۔ اپنے فعل کا تو انتظام ہو سکتا ہے کہ برا ماننے کا طرز نہ اختیار کرے مگر دوسرے کے فعل کی فکر و پروا نہ کرے۔ ہاں نہی عن المنکر میں اگر اندیشہ ہو ایسی اذیت کا کہ جس اذیت کا یہ متحمل نہ ہو تو اس وقت نہی عن المنکر معاف ہے۔ اور جہاں ایسی اذیت نہیں فقط یہ اندیشہ ہے کہ مخاطب برا مانے گا یا ہمارا مرتبہ اسکی نظر میں کم ہو جاویگا یا ہمیں شاید کچھ دینے کا ارادہ رکھتا ہو تو نہ دیگا۔ یہ سب خیال فاسد ہیں اس کی وجہ سے نہی عن المنکر معاف نہیں ہے۔ مگر اب تو یہ نوبت ہے۔ کہ محض اپنے حفظ جاہ و مال کیلئے نہی عن المنکر سے بچتے ہیں۔ اللہ کے بندے ایسے ہی تو ہوئے ہیں کہ نہی عن المنکر یا امر بالمعروف میں اندیشہ تو کیا مقاسات اذیت بھی ہو جاوے تب بھی وہ باز نہیں آتے چنانچہ حکایت ہے کہ ایک مقام پر جامع مسجد میں ایک تاجر عطر آیا۔ جماعت کے بعد لوگ حسب معمول سنتیں پڑھنے لگے۔ اتفاق سے نمازیوں میں کوئی بڑے عہدہ دار بھی تھے۔ وہ سنتوں میں وہی رسمی اٹھک بیٹھک کرنے لگے جس میں ارکان کی تعدیل نہ تھی۔ جب سلام پھیرا تو اس تاجر نے جو ایک غریب آدمی تھا سامنے آ کے سلام کیا اور عرض کیا حضور آپ کی نماز ٹھیک نہیں ہوئی۔ اسے پھر پڑھ لیجئے۔ کیونکہ مجھے آپکے وقت کا بڑا قلق ہے کہ یہ یونہی رائگاں جا رہا ہے۔ اس نماز سے آپکو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ بس اتنا سننا تھا کہ مارے غصہ کے آگ ہو گئے۔ کہ نالائق بیہودہ۔ تیری یہ جرأت ارے تجھے کیا۔ چپ رہ خبردار جو پھر ایسی گستاخی کی۔ اس نے کہا صاحب یہ گستاخی نہیں خیر خواہی ہے۔ کہ نماز پھر پڑھ لیجئے۔ بہرحال دونوں میں یہاں تک گفتگو بڑھی

اور جو انبیاء علیہم السلام کا خاص کام ہے۔ یعنی تبلیغ و اشاعت جو بذریعۂ وعظ ہوتی ہے
اس کا کہیں پتہ بھی نہیں۔ بلکہ جو اساتذہ علامہ کہلاتے ہیں وہ اسے موجب تذلیل
وتحقیر و باعث استخفاف اور ننگ و عار سمجھتے ہیں اور اس زعم باطل میں مبتلا ہیں
کہ وعظ کہنا جاہلوں کا کام ہے۔ بس جی جب تمنے اسے جاہلوں کا کام سمجھ کر چھوڑ دیا۔
تو پھر جاہلوں ہی نے اسے لے لیا۔ جنہیں معانی کی تو کیا خبر ہوتی۔ الفاظ تک درست
اور صحیح نہیں ادا کر سکتے۔ لوگوں نے وعظ کہتے دیکھکر انہیں عالم سمجھ لیا اور عالم سمجھ کر
بعد وعظ کے فتوی پوچھنے شروع کر دئے۔ یہ بیچارے عالم تو تھے نہیں مگر یہ کہتے شرم آئی
کہ مجھے مسائل نہیں معلوم مجبوراً جو جی میں آیا بتا دیا۔ اور غلط سلط فتوی دے دیا
حدیث شریف میں ہے۔ اتخذوا رؤساء جہالا فافتوا بغیر علم فضلوا واضلوا
کہ آخر زمانہ میں لوگ سردار بنا لینگے جاہلوں کو جو بغیر علم کے فتوی دینگے۔ خود بھی گمراہ
ہونگے۔ لوگوں کو بھی گمراہ کرینگے۔ تو یہ نوبت کیوں آئی۔ صرف اسلئے کہ جبکہ یہ کام تھا
انہوں نے چھوڑ دیا۔ اور اپنے لیئے موجب استخفاف سمجھا حالانکہ یہ حضرات انبیاء کا
اصل کام تھا ان حضرات نے سوائے وعظ و پند اور تبلیغ و اشاعت کے کبھی مدرسہ
نہیں بنایا۔ مگر اس سے یہ شبہ نہو کہ جب انبیاء علیہم السلام نے مدرسہ نہیں بنایا
تو مدرسے بیکار رہیں۔ یہ بیکار نہیں ہیں یہ نماز کے لئے بمنزلۂ وضو کے ہیں کہ جس طرح
نماز کے لیئے وضو ضروری ہے اسی طرح تبلیغ و اشاعت کے لئے مدارس کا وجود ضروری
ہے۔ ہاں بعد فراغ تبلیغ و اشاعت سے باز رہنا ایسا ہی ہے جیسا کوئی وضو کرکے
نماز نہ پڑھے۔ تو وہاں مدارس کی اسلئے ضرورت نہ تھی کہ علوم کا محفوظ رہنا عادۃً
ان پر موقوف نہ تھا علوم سماع سے محفوظ تھے اور وہاں رات دن اون کی تبلیغ
و اشاعت ہی سے کام تھا سفر میں حضر میں چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے شغل ان
حضرات کا دعوۃ الی اللہ ہی تھا۔ تو جو کام انبیاء علیہم السلام کا اصلی کام تھا اس کو
موجب عار و استخفاف سمجھنا کتنی بڑی غلطی و گستاخی ہے۔ اب رہا یہ کہ پڑھنا
پڑھانا پھر کیوں ضروری ہے۔ اصل تو یہی تھا کہ آپ دوسرے کو یوں ہی کہتے سنتے مگر نہ تو

چلیئے گھر میں بلایا ہے۔ کہا چلو آتے ہیں۔ پھر آئی پھر آئی ان کا وہ ایک ہی جواب حتی کہ اُس کا انتقال بھی ہو گیا۔ تب بھی وہی سبق کہ اچھا چلو آتے ہیں۔ اب اُسے غسل دیا جا رہا ہے۔ اچھا چلو آتے ہیں۔ کفن دیا جا رہا ہے۔ اچھا چلو آتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ دفن کر دیا گیا۔ مگر یہاں ہر مرتبہ میں وہی اچھا چلو آتے ہیں۔ وہاں تو یہ فکر ہے کہ کہیں ہار نہ جاویں۔ ایک ایک بازی میں ساری ساری رات گذر جاتی ہے اور ایسا انہماک ہوتا ہے کہ اپنے کھانے پینے اور کسی کے مرنے جینے کا بھی ہوش نہیں رہتا تو نماز کی کسے پروا ہوتی ہے۔ بالکل اسکی خاصیت وہی ہے جو قرآن مجید میں شراب کی بیان کی گئی ہے۔ کہ ویصدکم عن ذکر اللہ۔ یعنی شراب تمکو خدا کی یاد سے روکتی ہے اب آپ خود ہی غور کیجئے کہ شطرنج میں خدا یاد آتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ الغرض ان حضرت ماؤل صاحب کو اس سے بحث نہیں کہ شطرنج میں خارجی کتنے مفاسد ہیں یہ تو لالچ کے مارے کہدینگے کہ بعض ائمہ کے نزدیک مباح ہے۔ تو یہ حالت ہے۔ طمع میں۔ دین فروشی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ خود تو کیا منکرات سے منع کرینگے۔ اگر کوئی اور بھی منع کرے تو اس کا معارضہ کرینگے۔ الغرض دیکھ لیجئے کہ رات دن کے ہمارے اوقات میں دعوۃ الی اللہ کے جس کے شعبے ہیں دعوۃ الی الطاعات امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، حصہ میں کے منٹ آتے ہیں۔ غرض دوسرے کی اصلاح کی ذرا بھی فکر نہیں ہے۔ خلاصہ اس مضمون کا یہ ہے کہ اپنی اصلاح کے ساتھ دوسرے کو بھی خطاب ہونا ضروری ہے۔ خواہ وہ خطاب خاص ہو یعنی جس شخص کا جس پر اثر خاص ہے اس کو روزمرہ کی مخالطت و مکالمت میں ضروریات دین سے آگاہ کیا جاوے جیسے اپنے اہل وعیال دوست واحباب اور ملنے جلنے والوں کو آگاہ کیا خواہ خطاب عام ہو کہ مجمع عام کو وعظ کے طور پر پند و نصائح کی جاویں خواہ وہ اہل اسلام ہوں خواہ غیر اہل اسلام۔ مگر خطاب خاص کی طرح اس خطاب عام یعنی وعظ کے باب میں کس قدر کوتاہی ہے۔ ہم لوگ جو لکھے پڑھے کہلاتے ہیں بس طالبعلموں کے پڑھانیکو بڑی معراج سمجھتے ہیں۔ مگر جو غایت اصلی اور غرض صحیح تعلیم و تعلم سے ہے

جمع کرنا ضروری ہے۔ ایسے ہی تبلیغ کے لئے پڑھنا پڑھانا ضروری ہے۔ مگر اگر کوئی شخص وضو اور لوٹوں ہی کے اہتمام میں رہے۔ اور پانی ہی بھرا کرے اور نماز کا وقت گذر جاوے۔ تو کیا یہ شخص قابل مدح ہے؟ پس اسی طرح پڑھنا پڑھانا دعوۃ الی الحق کے صرف مقدمات ہیں۔ مگر اب ان مقدمات میں ایسی مشغولی ہوئی۔ کہ اصل کام کو بھی بھول گئے۔ افسوس جو لوگ اس کے اہل تھے وہ بھی اس کو بھولے ہوئے ہیں کہ وہ مقدمات ہی میں مشغول ہیں مقصود میں وقت صرف نہیں کرتے۔ حق تعالیٰ ان آیات میں جو میں نے شروع میں تلاوت کی ہیں۔ اسی عمل کی فضیلت بیان فرماتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے۔ ومن احسن قولا ممن دعا الی اللہ وعمل صالحا وقال اننی من المسلمین ؕ (ترجمہ) کون شخص ہے زیادہ احسن از روئے قول کے اس شخص سے جو خدا کی طرف بلاوے۔ استفہام انکاری ہے۔ یعنی اس سے اچھا کسی کا قول نہیں جو اللہ کی طرف بلاوے۔ احسن سے معلوم ہوا کہ اچھی باتیں تو اور بھی ہیں۔ مگر جتنی اچھی باتیں ہیں ان سب میں زیادہ اچھی بات دعوۃ الی اللہ ہے۔ استفہام بقصد نفی ہے سبحان اللہ کیا بلاغت ہے کہ پوچھتے ہیں کون ہے احسن از روئے قول کے۔ اسمیں مبالغہ زیادہ ہے [illegible] جگہ یہ ترد د ہوتا ہے کہ کوئی خلاف جواب دیدے گا۔ وہاں پوچھا نہیں کرتے۔ مثلاً یوں کہتے ہیں کہ میاں فلاں تجارت سے اچھی کونسی تجارت ہے۔ یہ وہاں کہتے ہیں۔ جہاں مخاطب کو متکلم کی رائے سے اختلاف ہو۔ اور جہاں یہ گمان ہوتا ہے۔ کہ شاید مخاطب خلاف جواب دیدے وہاں پوچھا نہیں کرتے بلکہ یوں تبلاتے ہیں۔ کہ میاں اس سے اچھی کوئی تجارت نہیں اور جہاں یہ احتمال نہیں ہوتا بلکہ اعتماد ہوتا ہے۔ کہ مخاطب بھی پوچھنے پر یہی جواب دیگا۔ وہاں پوچھا کرتے ہیں کہ تمہیں تبلاؤ کہ کون سی بات زیادہ اچھی ہے۔ کیونکہ ظاہر بات ہے کہ بدیہی اور حسی بات کا کوئی انکار نہیں کرتا۔ اسی طرح اس دعوۃ الی اللہ کی فضیلت اتنی صاف بدیہی اور محسوس تھی کہ صرف پوچھنا کافی ہوگیا۔ گویا یہ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا کہ اس سے اچھی فلاں بات ہے۔ تو استفہام میں تو یہ بلاغت ہے۔

سلف کا سا تقویٰ رہا نہ حافظہ۔ اگر ایسے ہی رہنے دیا جاتا تو یہ اطمینان نہ تھا کہ سُنے ہوئے مسائل یاد رہینگے۔ دوسرے تقویٰ کی کمی سے دیانت بھی روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔ تو اس حالت میں یہ بھی اعتماد نہ تھا کہ جو نقل کرتا ہے۔ راوی سے یہ ٹھیک بھی ہے۔ یا اپنی طرف سے کچھ کمی بیشی کر رہا ہے۔ جب یہ آثار ظاہر ہونے لگے تو سلف صالحین کو توجہ ہوئی کہ دین کو ضبط کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اسی بنار پر انہوں نے راویوں کے تذکرے (اسمار الرجال) لکھے کہ کون راوی قوی الحافظہ ہے۔ کون ضعیف الحافظہ اُن کی ولادت و وفات کی تاریخیں اور اُن کے سفر تحصیل علم کے واقعات جمع کئے کہ کس نے اس سے سیکھا اور اُسنے کس سے سیکھا انہی اعتبارات سے احادیث کے بہت سے اقسام نکلے۔ اور اب کسی حدیث میں شبہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ خوب پرکھ لیا گیا کہ کون حدیث کس درجہ کی ہے۔ پھر حدیثوں سے احکام مستنبط کرکے مدون کر دیئے کہ احکام کے سمجھنے میں گڑبڑ نہ ہو۔ تو تبلیغ و اشاعت کے لیے علم صحیح کی ضرورت تھی اور اُس کے محفوظ رکھنے کے لیے کتابوں کے لکھے جانے کی ضرورت ہوئی۔ پھر یہ ضرورت ہوئی کہ ایک باقاعدہ جماعت ہو جن کا کام صرف اس طریق سے دین کی حفاظت ہو۔ اسکے لیئے پڑھانے والوں کی ضرورت ہوئی۔ اور اُن کی ایک تو یہ صورت تھی کہ جہاں موقع مل گیا کسی سے پوچھ لیا راستہ میں کسی سے ایک سطر کسی سے دو سطر حل کر لیں۔ تو اس طرح باقاعدہ تحصیل نہیں ہو سکتی تھی۔ اسلئے مستقل جماعت کی ضرورت ہوئی کہ وہ ہر وقت اس کے لیے تیار رہیں کہ جو اُن سے پوچھنے آئے اُسے قاعدہ کے ساتھ بتائیں۔ پھر اُس جماعت کے لیے سامان فراغ کی ضرورت ہوئی کہ کھانے پینے رہنے سہنے کا اُن کے لیے کافی انتظام ہو۔ اس طرح مدارس کی ضرورت پیدا ہو گئی۔ تو بہر حال اصل کام دعوۃ الی اللہ ہے۔ اور اسکے محفوظ و قائم رکھنے کیلئے مدارس کی ضرورت ہے۔ اب یہ چاہیئے کہ جب مدارس سے علم ضروری حاصل کر لیں تو دعوۃ الی اللہ بھی کیا کریں جس کا آسان ذریعہ وعظ ہے۔ اور پڑھنا پڑھانا اُسکا مقدمہ ہے۔ اس لیئے یہ شغل بھی ضرور رکھیں۔ جیسے نماز کے لیے [illegible]

اول کا قول یا دعوت احسن ہے. ثانی کا قول یا دعوت غیر احسن ہے باقی یہ کہ اس کی لم کیا ہے کہ دعوت بلا عمل صالح غیر احسن ہے. تو اول یہ سمجھنا چاہیئے کہ احسن ہونا کیوں ہے. سو بات یہ ہے. کہ ہر شے کی ایک حقیقت ہوا کرتی ہے اور اس کی غایت ہوتی ہے تو قول احسن کی بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ ایک طاعت ہے اور ایک اس کی غایت ہے اور وہ غایت یہ ہے. کہ وہ دعوت سبب ہے دوسرے شخص کے رجوع الی الخیر کا۔ تو دعوۃ الی اللہ کو جو اچھا کہا گیا دو وجہ سے کہا گیا ایک تو اس وجہ سے کہ یہ سبب ہے لوگوں کے متوجہ الی اللہ ہونے کا تو یہ احسنیت تو باعتبار غایت کے ہے. اور دوسری اس وجہ سے کہ وہ فی نفسہا طاعت ہے. اور دونوں درجوں میں اوسکا احسن ہونا مشروط ہے عمل صالح کے ساتھ اسکے لئے ایک دوسرا مقدمہ سمجھئے کہ طاعت کے دو درجے ہوتے ہیں ایک کی نورانیت قوی اور ایک کی نورانیت ضعیف ہوتی ہے. اور اس قوت نورانیت کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے. کہ ایک طاعت کرنے سے دوسری طاعت میں نور بڑھتا ہے جس سے اس کی نورانیت قوی ہوجاتی ہے. جیسے ایک چراغ کی روشنی ہلکی ہوتی ہے اور دوسرا چراغ بھی جلا دیا جائے. تو اس پہلے چراغ کی روشنی اور نورانیت میں اضافہ ہوجائیگا. سو طاعات میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے. کہ ایک طاعت دوسری طاعت کے نور کو بڑھاتی اور قوی کرتی ہے. چنانچہ عابدین و سالکین خوب جانتے ہیں کہ اگر اتفاق سے ایک عمل قضا ہوجاوے تو دوسرے عمل میں وہ لطف محسوس نہیں ہوتا۔ اگر ایک دن تہجد قضا ہوجاوے تو سارے دن کی عبادت میں وہ لطف محسوس نہیں ہوتا جو پہلے ہوتا تھا ؎

بر دل سالک ہزاراں غم بود گر ز باغِ دل خلالے کم بود

یعنی باغِ دل میں سے ایک تنکا بھی کم ہوجاتا ہے. تو ہزاروں غموں کا سامنا ہوتا ہے سو یہ حالت مشاہد و محسوس ہے. اسی طرح اس طاعت یعنی دعوت الی اللہ کا نور بھی دوسرے طاعت یعنی عمل صالح سے قوی ہوتا ہے. یہ تو احسنیت باعتبار حقیقت کے ہے. اب احسنیت باعتبار غایت کو سمجھیے وہ یہ کہ دعوت الی اللہ میں وعظ کا

اب احسن قولاً کی تحقیق رہی سو یہ افعل التفضیل کا صیغہ ہے۔ یعنی کس کی گفتگو سب سے اچھی ہے، وجہ اس ترجمہ کی ظاہر ہے کیونکہ احسن باعتبار قصد کے صفت ہے قولاً کی۔ اور اقوال ہی کے اعتبار سے اس کی تفضیل بھی ہے اور چونکہ مفضل جنس مفضل علیہ ہی سے ہوتا ہے۔ تو معنی یہ ہوں گے کہ سب قولوں سے اچھا اس شخص کا یہ قول ہے اور یہاں تک تو کوئی اشکال نہ تھا۔ مگر آگے ارشاد ہے وعمل صالحًا۔ اور عمل صالح بھی کرے۔ اس جملہ کو اس کے معطوف علیہ کے ساتھ ملانے سے حاصل یہ ہوا کہ سب سے اچھی بات اُس شخص کی ہے۔ جو دعوت الی اللہ کرے اور نیک کام کرے۔ اس میں اشکال یہ ہے۔ کہ دعوت الی اللہ کو تو احسنیت قولاً میں دخل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہ خود قول ہے اور سب سے احسن مگر عمل صالح کا اس میں کیا دخل کیونکہ وہ فعل ہے قول نہیں۔ اسکا جواب یہ ہے کہ اگرچہ وہ قول نہیں مگر آداب و تکملات قول سے ہے اس لئے یہ بھی قول کے احسن ہونے میں دخیل ہے۔ تو حاصل یہ ہوا کہ صاحب قول احسن وہ ہے جو دعوت الی اللہ بھی کرے اور اس کی ساتھ ہی خود عمل بھی اچھا کرے۔ یعنی جو کچھ کہے اسکے موافق عمل بھی کرے تب وہ صاحب قول احسن ہے اسپر یہ سوال پیدا ہوگا کہ کوئی بہت اچھی بات کرے اور عمل اچھا نکرے تو قول تو اچھا ہے، گو عمل نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی دعوت الی الاسلام کرے اور خود مسلمان نہو۔ دعوت الی الصلوٰۃ کرے اور خود نمازی نہو اسلام کے اوصاف بیان کرے اور خود اُن پر عقیدہ نہ رکھے تو اس پر من احسن قولاً تو صادق آتا ہے کیونکہ اس کے معنی من قولہ احسن ہیں یعنی جس کی بات بہت اچھی ہو۔ وہ احسن قولا ہے۔ جب یہ بات سمجھ میں آگئی۔ تو اب اگر کوئی خود عمل نکرے تو اُسکے قول کی احسن ہونے میں کیا خلل رہا۔ اگر اُس نے خود نماز نہ پڑھی۔ تو اُس کا یہ قول تو احسن ہے زائد سے زائد یہ کہہ سکتے ہیں کہ عمل احسن نہیں۔ تو اس سے قول کے احسن ہونے میں کیا خلل [illegible] قرآنی تعبیر اس سے کچھ نہیں ہو سکتا کہ قول کے اچھے ہونے میں عمل [illegible] [illegible] [illegible] ایک [illegible] عمل صالح [illegible] صاحب عمل صالح

کہ ایک مقام پر میں بلایا گیا تھا اور وہ واعظ صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ اس شان
سے کہ سکنڈ میں سفر کیا اور اپنے ساتھ دس پندرہ مصاحبوں کو بھی لائے۔ بیچارہ
سکریٹری کہتا تھا کہ میرا تو انہوں نے کورٹ کروادیا۔ میں کیا جانتا تھا۔ کہ وہ
اس قدر خرچ کردینگے۔ خیر جب وہاں پہونچے۔ بارش کا موسم تھا میں تو برآمدہ میں
لیٹ رہا۔ مگر ان حضرت سے یہ گوارا نہ ہوا کہ برآمدہ میں لیٹتے۔ آپ اندر لیٹے اور
وہاں گرمی تھی۔ سکریٹری سے بلا کر کہا کہ دو آدمی رات بھر پنکھا جھلنے کے لئے
متعین کرو تاکہ رات بھر باری باری پنکھا جھلیں۔ چنانچہ سکریٹری کو یہ بھی کرنا پڑا
صبح کو پانی زور کا برس رہا تھا جس سے مسجد میں جانا مشکل تھا اس لئے ہم نے
تو اٹھ کر وہیں نماز پڑھ لی۔ مگر وہ حضرت اندر ہی پڑے سوتے رہے اور صبح کی نماز اڑادی
اب جنکو انہوں نے وعظ سنایا ہوگا۔ بھلا ان پر کیا اثر ہوا ہوگا۔ مگر اس تقریر سے کہیں
یہ نہ سمجھنا کہ اگر عمل نہ ہو تو وعظ ہی نہ کہے۔ جیسا بہت لوگوں کو یہ بھی غلطی ہو جاتی ہے
واقعی اس طریق میں ہر ہر قدم پر لغزشیں ہیں جن سے بچنے کے لئے نہایت ہی صحیح
علم کی ضرورت ہے ؎

در راہ عشق وسوسہ اہرمن بسے ست ہشدار و گوش را بہ پیام سروش دار

یعنی قدم قدم پر شیاطین کے وسوسے ہیں۔ ان سے ہوشیار رہو اور اپنے کان وحی
کی طرف لگائے رکھو۔ تو ایک وسوسہ تو یہ ہوا تھا کہ عمل نہیں کیا اور نصیحت شروع کی۔
دوسرا وسوسہ یہ ہوا کہ جس روز عمل کی ضرورت سمجھ میں آئی تو نصیحت ہی چھوڑ دی جیسے
ایک نیم ملانے گاؤں کے ایک چودھری کو مسئلہ بتایا کہ نیت بغیر روزہ نہیں ہوتا
اسنے پوچھا نیت کیا ہے۔ آپ نے کہا نیت یہ ہے اللھم لصوم غد نویت دوسرے
روز جو دیکھا تو چودھری مزہ سے بیٹھا حقہ پی رہا ہے۔ پوچھا ارے یہ کیا روزہ نہیں
رکھا؟ اسنے کہا صاحب میں کیا کروں۔ بدون نیت روزہ ہوتا نہیں اور نیت
ابھی یاد نہیں ہوئی۔ اس میں اسکی بھی غلطی ہے۔ نہ یہ پھر مسئلہ پوچھ لیتا کہ اگر کسی کو نیت
یاد نہ ہو تو کیا کرے۔ اور مولوی صاحب کی بھی غلطی ہے۔ کہ خواہ مخواہ انہوں نے گنوار کو

مقصود فی نفسہ کیا ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ اتعاظ یعنی مخاطب کا متوجہ الی اللہ ہوجاتا ہے یعنی
اُس کا اثر فی نفسہ یہی ہے۔ گو کسی عارض کے سبب اُس کا ترتب نہ ہوا اور عمل صالح کو
اس غایت کے اعتبار سے احسنیت میں یہ دخل ہے کہ مشاہدہ ہے کہ اگر ناصح خود عمل
نکرے تو اُس کی نصیحت میں اثر نہیں ہوتا۔ اور جو خود عمل کرتا ہے اُس کی نصیحت میں اثر
ہوتا ہے۔ اور علاوہ تاثیر فی نفسہ کے اُس کا ایک طبعی سبب بھی ہے۔ وہ یہ کہ اگر خود
اُس پر ناصح کا عمل ہو تو مخاطب کو یہ شبہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر یہ عمل ضروری ہوتا تو یہ
ناصح خود کیوں نہ کرتا۔ معلوم ہوتا ہے۔ غیر ضروری ہے۔ چنانچہ ایک طبیب کی حکایت ہے کہ وہ
مریضوں کو یہ بتایا کرتے تھے۔ کہ پانی پینا چھوڑ دو۔ اور خود خوب کثرت سے پیتے تھے۔
اس لئے مریض کو شبہ ہوجاتا تھا کہ پانی کوئی ایسی مضر چیز نہیں۔ ورنہ حکیم صاحب
خود کیوں پیتے۔ چنانچہ اس کو محسوس کرکے ان طبیب نے اپنی نصیحت پر آخر عمر میں
ایک نہایت موثر عمل کیا۔ کہ مرتے وقت جب موت کی تشنگی ہوئی تو شربت پیش
کیا گیا۔ تو کہا میں نہیں پیونگا۔ زندگی بھر تو لوگوں کو پیاسا رکھا۔ کہ ان کو پانی پینے سے
منع کرتا رہا۔ اُن کی پیاس کی کچھ پرواہ نہ کی۔ اب اخیر وقت میں تو کم از کم اونکا ساتھ
دونگا۔ چنانچہ شربت نہ پیا اور جان نکل گئی۔ حضرت اس واقعہ کا اس قدر اثر ہوا کہ
اُن کی ہدایت پر عمل ہونے لگا۔ تو عمل وہ چیز ہے۔ کہ نصیحت کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے
ایک جگہ میں گیا وہاں ایک اسکول بھی تھا جس میں مسلمانوں کے بچے پڑھتے تھے
اور ماسٹر اُس کا ہندو تھا۔ وہاں لوگوں نے مجھ سے ماسٹر کی بڑی تعریف کی کہ یہ
روزانہ پانچ وقت کی نماز پڑھوانے کے لئے لڑکوں کو مسجد لیجاتے ہیں میں نے کہا
کہ اُن کا نماز پڑھوانا کچھ مفید نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ روزانہ پانچ وقت بچوں کے دل میں
یہ سوال پیدا ہوتا ہوگا کہ اگر نماز کوئی ضروری چیز ہے تو ماسٹر صاحب خود کیوں نہیں
پڑھتے۔ اسلئے ضرورت ہے۔ کہ نماز پڑھوانیوالا مسلمان ہونا چاہیئے۔ اور حقیقت میں
یہی ہوتا ہے۔ کہ علماء باعمل کا جو اثر ہوتا ہے۔ وہ علمائے بے عمل کا نہیں ہوتا
میں نے خود ایک مقام پر ایک واعظ صاحب کو دیکھا کہ صبح کی نماز نہیں پڑھی۔ واقعہ یہ ہوا

کہ ایک مقام پر میں بلایا گیا تھا اور وہ واعظ صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ اس شان سے کہ سکنڈ میں سفر کیا اور اپنے ساتھ دس پندرہ مصاحبوں کو بھی لائے۔ بیچارہ سکریٹری کہتا تھا کہ میرا تو انہوں نے کورٹ کروا دیا۔ میں کیا جانتا تھا۔ کہ وہ اس قدر خرچ کر دینگے۔ خیر جب وہاں پہونچے۔ بارش کا موسم تھا میں تو برآمدہ میں لیٹ رہا۔ مگر اُن حضرت سے یہ گوارا نہوا کہ برآمدہ میں لیٹتے۔ آپ اندر لیٹے اور وہاں گرمی تھی۔ سکریٹری سے بلا کر کہا کہ دو آدمی رات بھر پنکھا جھلنے کے لئے متعین کرو تاکہ رات بھر باری باری پنکھا جھلیں۔ چنانچہ سکریٹری کو یہ بھی کرنا پڑا صبح کو پانی زور کا برس رہا تھا جس سے مسجد میں جانا مشکل تھا اس لیئے میں نے تو اُٹھ کر وہیں نماز پڑھ لی۔ مگر وہ حضرت اندر ہی پڑے سوتے رہے اور صبح کی نماز اڑا دی اب جنکو انہوں نے وعظ سنایا ہوگا۔ بھلا اُن پہ کیا اثر ہوا ہوگا۔ مگر اس تقریر سے کہیں یہ نہ سمجھنا کہ اگر عمل نہو تو وعظ ہی نہ کہے۔ جیسا بہت لوگوں کو یہ بھی غلطی ہو جاتی ہے واقعی اس طریق میں ہر ہر قدم پر لغزشیں ہیں جن سے بچنے کے لئے نہایت ہی صحیح علم کی ضرورت ہے ؎

در راہ عشق وسوسۂ اہرمن بسے ست — ہشدار و گوش را بہ پیام سروش دار

یعنی قدم قدم پر شیاطین کے وسوسے ہیں۔ ان سے ہوشیار رہو اور اپنے کان وحی کیطرف لگائے رکھو۔ تو ایک وسوسہ تو یہ ہوا تھا کہ عمل نہیں کیا اور نصیحت شروع کی۔ دوسرا وسوسہ یہ ہوا کہ جس روز عمل کی ضرورت سمجھ میں آئی تو نصیحت ہی چھوڑ دی جیسے ایک نیم ملاّنے گاؤں کے ایک چودھری کو مسئلہ بتایا کہ نیت بغیر روزہ نہیں ہوتا اُسنے پوچھا نیت کیا ہے۔ آپ نے کہا نیت یہ ہے اللّٰھم لصوم غد نویت دوسرے روز جو دیکھا تو چودھری مزہ سے بیٹھا حقہ پی رہا ہے۔ پوچھا ارے یہ کیا۔ روزہ نہیں رکھا؟ اُسنے کہا صاحب میں کیا کروں۔ بدون نیت روزہ ہوتا نہیں اور نیت ابھی یاد نہیں ہوئی۔ اس میں اسکی بھی غلطی ہے۔ کہ یہ پھر مسئلہ پوچھ لیتا کہ اگر کسی کو نیت یاد نہو تو کیا کرے۔ اور مولوی صاحب کی بھی غلطی ہے۔ کہ خواہ مخواہ انہوں نے گنوار کو

مقصود فی نفسہ کیا ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ اتعاظ یعنی مخاطب کا متوجہ الی اللہ ہو جاتا ہے یعنی اُس کا اثر فی نفسہ یہی ہے۔ گو کسی عارض کے سبب اُس کا ترتب نہ ہو اور عمل صالح کو اس غایت کے اعتبار سے احسنیت میں یہ دخل ہے کہ مشاہدہ ہے کہ اگر ناصح خود عمل نکرے تو اُس کی نصیحت میں اثر نہیں ہوتا۔ اور جو خود عمل کرتا ہے اُس کی نصیحت میں اثر ہوتا ہے۔ اور علاوہ تاثیر فی نفسہ کے اُس کا ایک طبعی سبب بھی ہے۔ وہ یہ کہ اگر خود اُس پر ناصح کا عمل ہو تو مخاطب کو یہ شبہہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر یہ عمل ضروری ہوتا تو یہ ناصح خود کیوں نہ کرتا۔ معلوم ہوتا ہے۔ غیر ضروری ہے۔ چنانچہ ایک طبیب کی حکایت ہے کہ وہ ہر مریض کو یہ بتایا کرتے تھے۔ کہ پانی پینا چھوڑ دو۔ اور خود خوب کثرت سے پیتے تھے۔ اس لئے مریض کو شبہہ ہو جاتا تھا کہ پانی کوئی ایسی مضر چیز نہیں۔ ورنہ حکیم صاحب خود کیوں پیتے۔ چنانچہ اس کو محسوس کر کے اُن طبیب نے اپنی نصیحت پر آخر عمر میں ایک نہایت مؤثر عمل کیا۔ کہ مرتے وقت جب موت کی تشنگی ہوئی تو شربت پیش کیا گیا۔ تو کہا میں نہیں پیونگا۔ زندگی بھر تو لوگوں کو پیاسا رکھا۔ کہ اُن کو پانی پینے سے منع کرتا رہا۔ اُن کی پیاس کی کچھ پرواہ نہ کی۔ اب آخیر وقت میں تو کم از کم اونکا ساتھ دونگا۔ چنانچہ شربت نہ پیا اور جان نکل گئی۔ حضرت اس واقعہ کا اس قدر اثر ہوا۔ کہ اُن کی بُرائی پر عمل ہونے لگا۔ تو عمل وہ چیز ہے۔ کہ نصیحت کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہی ایک جگہ میں گیا وہاں ایک اسکول بھی تھا جس میں مسلمانوں کے بچے پڑھتے تھے اور ماسٹر اُس کا ہندو تھا۔ وہاں لوگوں نے مجھ سے ماسٹر کی بڑی تعریف کی کہ یہ روزانہ پانچ وقت کی نماز پڑھوانے کے لئے لڑکوں کو مسجد لیجاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اُن کا نماز پڑھوانا کچھ مفید نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ روزانہ پانچ وقت بچوں کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہوگا کہ اگر نماز کوئی ضروری چیز ہے تو ماسٹر صاحب خود کیوں نہیں پڑھتے۔ اسلئے ضرورت ہے۔ کہ نماز پڑھوانیوالا مسلمان ہونا چاہیئے۔ اور حقیقت میں یہی ہوتا ہے۔ کہ علماء باعمل کا جو اثر ہوتا ہے۔ وہ علمائے بے عمل کا نہیں ہوتا میں نے خود ایک مقام پر ایک واعظ صاحب کو دیکھا کہ صبح کی نماز نہیں پڑھی۔ واقعہ یہ ہوا

اور دوسرے نے کہا تو پہلے کے مقتدی سمجھے ہمارا امام کہہ رہا ہے۔ غرض بڑی پریشانی ہر جزو میں رہی قومہ رکوع سجدہ قعدہ سب میں یہی لطف رہا۔ ایک امام نے الحمد ختم کرلی۔ تو اب دوسرے کا انتظار ہے کہ یہ سورت چھوٹی پڑھتا ہے۔ یا بڑی اگر بڑی پڑھیگا تو میں چھوٹی شروع کردونگا تاکہ پہلے رکوع میں جا سکوں۔ اور اگر چھوٹی سے چھوٹی شروع کریگا۔ تو میں جلدی جلدی ختم کرکے رکوع کردونگا۔ بہرحال اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک رکوع میں پہونچا تو دوسرے کے بعض مقتدی غلطی سے رکوع میں جھک گئے تو پاس والا اس کے کہنی مارتا ہے۔ کہ یہ ہمارا امام نہیں۔ وہ بیچارہ پھر کھڑا ہوگیا۔ تو دیکھئے یہاں ان لوگوں نے نماز میں بھی جدال کھڑا کرلیا۔ مگر حج کے جھگڑوں کے مقابلہ میں یہ مثل شاذونادر کے ہے۔ اور وہاں تو بات بات پر ٹھنتی ہے۔ حتی کہ میں نے تو پیرو مریدمیں بھی لڑائی ہوتے دیکھی۔ حالانکہ اس سے بڑھکر دنیا میں کوئی علاقہ ادب واحترام کا نہیں ہوتا۔ تھے وہ پیر خوش اخلاق کہ لوٹ کے آئے تو صلح کرلی۔ پھر پیر پیر ہوگئے اور مرید مرید ہوگئے۔ خوش اخلاق کیا تھے۔ بات یہ تھی۔ کہ انہوں نے سوچا کہ کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہے۔ کیوں اسامیاں کم کرو۔ غرض ایسے واقعات کے سبب حج میں فرمایا گیا کہ ولاجدال فی الحج۔ علی ہذا روزہ میں بھی جیسا کہ اوپر عرض کیا ہے کہ اس میں بھی ہمارے اخلاق ظاہر ہوتے ہیں۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ کا بھی ایسا ہی انتظام فرمایا چنانچہ اوپر کی حدیث کا یہ بھی تتمہ ہے کہ فان سابہ احد فلیقل انی امرء صائم کہ جو روزہ رکھے اسے چاہیئے کہ غل شور نہ مچاوے اور نہ لڑے جھگڑے اور اگر کوئی اور لڑنے پر آمادہ ہو تو کہدے۔ کہ بھائی میرا تو روزہ ہے علماء نے اس کی دو توجیہیں کی ہیں بعض نے کہا ہے کہ کہدے کا مطلب یہ ہے کہ زبان سے کہدے جیسا کہ ظاہر لفظ سے معلوم ہوتا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے۔ کہ دل میں کہلے کہ میرا تو روزہ ہے میں لڑوں جھگڑوں گا تو روزہ خراب ہوجائے گا۔ مگر میرے نزدیک فیصلہ بین القولین یہ ہے کہ فرض میں تو زبان سے کہدے اور نفل میں دل [illegible] بھوک کی حالت تھی۔ اب پیٹ بھرے کی سینئے۔

عربی میں نیت بتلائی اول تو زبان سے کہنا ہی ضرور نہیں اور اگر کسی کو کہنا ہی ہے تو اردو ہی کافی ہے۔ اس چودھری کی حالت ہم جیسے طالبعلموں کی ہے۔ کہ واعظ کے لئے عمل کی ضرورت سنی تو یہ تو نہ ہوا کہ عمل شروع کرتے نہیں بلکہ وعظ ہی حذف ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی ۔۔۔ تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

کبھی ایک غلطی میں مبتلا ہیں کبھی دوسری غلطی میں اور ہماری حالت اکثر امور میں یہی ہے کہ جو کام کرینگے اس میں خرابی پیدا کرلیں گے جیسے مولانا کا ارشاد ہے ؎

چوں گرسنہ می شوی سگ می شوی ۔۔۔ چونکہ خوردی تند و بدرگ می شوی

یعنی یہ حالت ہے کہ بھوکے اور بلا میں مبتلا ہیں اور پیٹ بھرے اور بلا مبتلا ہیں چنانچہ ہمارے بھوکے ہونے کے وقت کے۔ اخلاق رمضان میں خوب ظاہر ہوتے ہیں۔ کسی کو تنباکو کی بھوک ہے کسی کو حقہ کی کسی کو افیون کی۔ پھر دیکھئے کہ اتنے جھلے ہو جاتے ہیں۔ کہ بات بات پر غصہ آتا ہے۔ ذرا سے میں لڑنے کو تیار اسی واسطے حق تعالیٰ نے ہمارے اخلاق کا انتظام ایسے مواقع میں خاص اہتمام سے فرمایا ہے چنانچہ روزہ میں ارشاد نبوی ہے۔ واذا کان یوم صوم احدکم فلا یرفث ولا یصخب الحدیث حج میں مشقتیں بہت پیش آتی ہیں۔ اور اس لئے ذرا ذرا سی چیز لکڑی پانی اور آگ پر جھگڑا ہو جاتا ہے۔ اس لئے اُس کا انتظام اس ارشاد سے فرمایا۔ فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج۔ کہ بے حیائی اور نافرمانی کی باتیں اور جنگ و جدال یا لڑائی جھگڑا حج میں نہیں ہے۔ دیکھئے یہ انتظام نماز کے متعلق نہیں فرمایا۔ کیونکہ نماز میں اتنے جھگڑے نہیں پیدا ہوتے۔ اور یوں کسی کی طبیعت ہی میں خرابی ہو وہاں بھی جھگڑے نکال لیتا ہے۔ مگر شاذ۔ جیسے ہمارے اضلاع میں ایک قصبہ کا واقعہ ہے کہ دو شخص عیدگاہ کی امامت کے مدعی تھے۔ دونوں جاکے مصلے پر کھڑے ہوگئے بعض مقتدی ایک کی طرف تھے۔ بعض دوسرے کی طرف گویا کچھ اُن کے ووٹ دینے والے تھے۔ اور کچھ اُن کے۔ غرض تمام صفوف میں دونوں کے مقتدین کا مجمع خلط ملط تھا۔ ایک نے اللہ اکبر کہا تو دوسرے کے مقتدی یہ سمجھے کہ ہمارا امام کہہ رہا ہے

جیسے ایک شاعر تھے ٹھوس تخلص تھا۔ تخلص ہی سے سمجھ لیجئے کہ وہ کیسے شاعر ہونگے۔
عموماً انکے اشعار میں یہ ہوتا تھا کہ ایک مصرع چھوٹا ایک بڑا ہوا کرتا تھا۔ کرتے یہ تھے
کہ ایک مصرعہ کیفما اتفق پہلے کاغذ پر لکھ لیا۔ اور اُسے سینک سے ناپ لیا۔ دوسرا مصرعہ
اُسی سینک کی برابر لکھ لیا۔ اگر عبارت زائد ہوئی باریک قلم سے اونچی جگہ میں لکھ لی
کسی نے اعتراض کیا کہ تمہارے اشعار میں ایک مصرعہ چھوٹا ایک بڑا ہوتا ہے۔
کہنے لگے کہ مولانا جامی کو تو مانتے ہو۔ کہ وہ کیسے اساتذہ میں ہیں انہوں نے بھی ایک
مصرعہ چھوٹا اور ایک بڑا کہا ہے۔ چنانچہ دیکھو (ع) آہی غنچۂ اُمید بکشا + اس مصرعہ کو
تو خوب ٹھیر ٹھیر کے اور ترتیل کے ساتھ پڑھا (ع) گلے از روضۂ جاوید بنما + اس
مصرعہ کو خوب جلدی سے پڑھ دیا۔ بس ایک چھوٹا ایک بڑا ہو گیا۔ تو لہجہ کو چھوٹا بڑا
بنا کر مصرعوں کو اُس کے تابع بنا لیا ورنہ۔ واقع میں تو دونوں مصرع برابر ہیں۔
تو صاحب لہجہ حقائق کے تابع ہے حقائق لہجہ کے تابع نہیں ہیں جہاں ایسا ہوگا
وہاں لہجہ کو غلط کہا جائیگا حقائق کو نہ بدلا جاویگا۔ اسے یوں سمجھیئے کہ کوئی کہے میں
طالب علم ہوں۔ اب اس کے دو محل ہیں ایک تو جاہل کے مقابلہ میں کہنا اور ایک کسی
بڑے علامہ کے مقابلہ میں کہنا۔ تو جاہل کے مقابلہ میں جو کہیگا۔ تو لہجہ میں ترفع اور
دعویٰ کی شان ہوگی۔ کہ میں طالب علم ہوں تم جاہل ہو میں تم سے بڑھکر ہوں اور جو
علامہ کے مقابلہ میں کہیگا اس کے لہجہ میں خود بخود نرمی اور انکسار ہوگا جس کا مطلب
یہ ہوگا کہ میں آپ کے مقابلہ میں کیا چیز ہوں۔ آپ کی بڑی شان ہے۔ آپ علامہ ہیں میں
محض ایک مبتدی ہوں تو عقلاء جانتے ہیں کہ لہجہ کے تفاوت سے ایک ہی فقرہ کے
دو مدلول ہو گئے۔ اسی طرح وقال انني من المسلمان۔ میں آپنے دعویٰ کا لہجہ بنا لیا
اور اُس کی صفت پر نظر کرنے کے اعتبار سے اُس لہجہ کو صحیح بھی سمجھ لیا حالانکہ
یہاں ذات اسلام مراد ہے۔ ذات اسلام کے کیا معنی ہیں۔ انقیاد۔
گردن نہادن یطاعت۔ اسلام کا لفظ عربی ہے۔ آپ نے اس آیت کے ترجمہ میں
بھی یہی لفظ دیکھا اس لئے مراد واضح نہیں ہوئی۔ ذرا اپنی زبان اس کا ترجمہ کیجئے

پیش آتا ہے۔ کہ وہ بد عملی ہے۔ اس کی اصلاح کے بعد ایک اور مفسدہ عارض ہوجاتا ہے۔ وہ یہ کہ وعظ اور عمل کی ساتھ ہی اس میں کبر وعجب بھی ہوجاتا ہے کہ میں بڑا صاحب کمال ہوں کہ اللہ میاں کے تمام حقوق ادا کرتا ہوں۔ حق تعالیٰ اس کے علاج کیلئے آگے تواضع کی تعلیم فرماتے ہیں وقال اننی من المسلمین یعنی اوسنے یوں بھی کہا کہ میں مسلمین میں سے ہوں۔ آپ کو غالباً حیرت ہوگی کہ یہ تو دعویٰ ہوا نہ کہ تواضع۔ بات یہ ہے۔ کہ اس قسم کے عنوانات میں عادت تو دعویٰ ہی کی ہے اس لئے یہاں بھی دعویٰ ہی معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہاں مقصود تواضع ہی ہے توضیح اس کی یہ ہے کہ اسلام ایک ایسی چیز ہے۔ جسمیں دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت تو یہ ہے کہ وہ طاعت کاملہ ہے۔ اور ایک حیثیت یہ ہے کہ وہ گردن نہادن بطاعت ہے گو یہ بھی کمال ہے مگر عنوان کمال کا نہیں ہے۔ یا یوں کہو کہ اسلام کی ایک ذات ہے اور ایک صفت ہے۔ جب ذات کے اعتبار سے اپنے اسلام پر نظر پڑتی ہے۔ تو اوس نظر کا اور اثر ہوتا ہے اور صفت کے اعتبار سے پڑتی ہے۔ تو اور اثر ہوتا ہے۔ ذات تو ہے۔ گردن نہادن بطاعت۔ اور صفت ہے طاعت کاملہ۔ جیسا کہ۔ ان الدین عند اللہ الاسلام اس پر دال ہے۔ یعنی خدا کے نزدیک دین صحیح وکامل سلام ہی ہے۔ اور چونکہ صفت تابع ہوتی ہے ذات کے۔ اس کا مقتضا یہ تھا کہ ہماری نظر اولاً اس کی ذات پر ہوتی۔ مگر اب حیرت ہوگی۔ کہ ہماری نظر اپنے اسلام پر ذات کی حیثیت سے نہیں پڑتی بلکہ صفت کی حیثیت سے پڑتی ہے۔ کہ ہم میں یہ صفت کمال ہے اور اسی بناء پر دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ کمال ہوتے ہیں تو شک نہیں گفتگو تو یہ ہے۔ کہ تابع پر نظر گئی اصل چیز یعنی ذات پر کبھی نظر نہ گئی۔ اسی لئے دعویٰ پیدا ہوگیا چونکہ اس جملہ کے تکلم میں خود عادت ہے۔ دعویٰ کرنے کی نہ کہ تواضع کی اسی لئے قرآن میں بھی سمجھ گئے کہ دعویٰ میں مستعمل ہے۔ حالانکہ یہاں تواضع مقصود ہے۔ اور دونوں قصد میں لہجہ بھی جدا جدا ہوتا ہے۔ تو بھائی یہ غلطی تو تمہاری ہے کہ بلہجہ دعویٰ پڑھکر دعویٰ مراد لے لیا تو گویا تمنے معانی کو تابع لہجہ کا بنا دیا۔ لہجہ دعویٰ کا کیوں اختیار کیا۔ لہجہ انقیاد کا کیوں نہ اختیار کیا

وہ تو ہوا ہے جو حرکت دیتی ہے لیکن ؎

حملہ شاں پیدا و ناپیدا ست باد　　آنکہ ناپیدا ست ہرگز کم مباد

یعنی حملہ تو نظر آتا ہے۔ مگر ہوا نظر نہیں آتی۔ اور ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

انت کالریح ونحن کالغبار　　یختفی الریح وغبراہ جہار

آپ مثل ہوا کے ہیں اور ہم مثل غبار کے۔ یہ سب تشبیہیں اور مثالیں ہیں۔ مگر وہ من کل الوجوہ ایسے نہیں ہیں کیونکہ حق تعالیٰ اتصال و حرکت سے پاک ہیں گو محرک میں نفس تحریک یہاں اور وہاں یکساں ہے۔ اور دونوں متحرک میں نحو حرکت بھی متحد ہے۔ اور چونکہ بعض کو شبہہ پیدا ہو کر الحاد کا اندیشہ تھا اس لئے مولانا نے اسکو خود ہی صاف کر دیا ؎

اے بروں از وہم و قال و قیل من　　خاک بر فرق من و تمثیل من

یعنی آپ ان سب سے منزہ اور سب سے پاک ہیں۔ جیسا کہ دوسرے عارف نے کہا ہے ؎

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم　　واز ہرچہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم

دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر　　ما ہمچناں در اول وصفت تو ماندہ ایم

اور واقعی حق تعالیٰ کی شان کا کیا احاطہ ہو سکتا ہے ؎

اے بروں از وہم و قال و قیل من　　خاک بر فرق من و تمثیل من

رہا یہ کہ جب وہ ہماری تمثیلات سے پاک و منزہ ہیں تو مثال کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس کی وجہ فرماتے ہیں ؎

بندہ نشکیبد ز تصویر خوشت　　ہر دمت گوید کہ جانم مفرشت

وہ ذہن میں آ سکتے ہیں اور نہ ذہن میں یعنی تشبیہ میں بھی اُن کی شان بیان نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے صوفیہ کا قول ہے۔ کل ما خطر ببالک فہو ھالک۔ واللہ اجل من ذلک جو کچھ تمہارے تصور میں آتا ہے۔ وہ فنا ہو جانے والا ہے۔ اور خدا اس سے بہت برتر ہے۔ تو وہ ان سب مثالوں سے پاک ہیں۔ مگر بندہ کو بدون کسی خاص تصور کے صبر نہیں آتا۔ تو یہ مثالیں مولانا نے بطور تشبیہ

تو پھر آپ کو معلوم ہو جائے کہ کیا مراد ہے۔ وہ ترجمہ یہ ہو گا کہ وہ شخص یہ بھی کہتا ہے یعنی میں تو تابعداری کرنے والا ہوں۔ غلامی کرنے والا ہوں۔ اب بتائیے یہ تواضع کی تعلیم ہوئی یا نہیں۔ تو آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ دعوۃ الی اللہ میں عمل صالح سے جس میں دعویٰ بھی نہیں پیدا ہوتا اس سے اچھا کسی کا قول نہیں۔ اور حقیقت میں دعویٰ کا بندہ کو حق ہی کیا ہے۔ مگر ہماری حقیقت ناشناسی ہے کہ ہم اپنی بیچارگی و عبدیت کی صفت بھول گئے۔ آقا نے کہا پانی پلاؤ۔ تو غلام نے یہ تو سمجھا کہ میں نے پانی پلایا تو بڑا احسان کیا۔ اور یہ نہ سمجھا کہ میں تو غلام ہی ہوں اس صفت کے بھول جانے سے ہمیں ہر چیز پر فخر ہے۔ نماز پر فخر روزہ پر فخر۔ وعظ پر فخر۔ ذکر و شغل پر فخر۔ اگر یہ سمجھتا کہ میں تو غلام ہوں۔ انہیں کے حکم سے اور انہیں کی توفیق سے کر رہا ہوں۔ اور اگر وہ ہمیں یہ کام نہ بتلاتے یا توفیق نہ دیتے تو کہاں سے کچھ کرتے۔ پس انّنی من المسلمین کے معنی یہ ہیں کہ میں تو فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ اور حقیقت میں ہم کرتے ہی کیا ہیں یہ تو اُن کی عنایت ہے۔ کہ اُنہوں نے سارا کام خود کرا کر ہماری طرف منسوب کر دیا

ع کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں — مصلحت را تہمتے برآہوئے چیں بستہ اند

ع کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل — نسیم صبح تیری مہربانی

ع عشق من پیدا و معشوقم نہاں — یار بیروں فتنہ او در جہاں

اسی باب میں مولانا فرماتے ہیں ع

ما ہمہ شیران ولے شیر علم — حملہ شاں از باد باشد دمبدم

خوب مثال دی ہے۔ پہلے یہ دستور تھا کہ علم پر تصویریں بنا دیا کرتے تھے اور اس میں بھی شیر کی تصویر اکثر بناتے تھے تو جب ہوا سے علم لہراتا تھا۔ تو یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ شیر حملہ کر رہا ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں۔ کہ تصویر بنانے کی اجازت ہے۔ یہ تو ایک مثال کے طور پر بیان کر دیا ہے ع

ما ہمہ شیراں ولے شیر علم — حملہ شاں از باد باشد دمبدم

ہم سب شیر ہیں مگر شیر علم ہیں کہ اُس کا حملہ ہوا کی بدولت ہے کہ اگر ہوا نہ ہو تو پڑے رہیں

جماعت بھی ہمارا کام چھوڑ دے تب بھی ہمارا کام نہیں رک سکتا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا
وان تتولوا یستبدل قوما غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم۔ اگر تم اعراض کرو تو وہ ایک
اور جماعت پیدا کر دیں گے۔ جو تمہارے مثل نہونگے۔ بلکہ وہ تم سے بہتر خدمت کرنیوالے
ہونگے۔ من المسلمین میں واحد واحد کی اصلاح تھی۔ اور یہاں جماعت کی صلاح ہی
اب صرف ایک شبہہ یہ رہا کہ ہر حال میں ضرورت تو پڑی ملازموں اور خدمتگاروں کی
جیساکہ استبدال تبلا رہا ہے۔ تو حدیث شریف میں جو کہ مثل کلام الہی کے ہی خاص کر
حدیث قدسی اس شبہہ کا بھی جواب ہے۔ لو ان جنکم وانسکم واولکم واخرکم
ورطبکم ویابسکم اجتمعوا علی قلب اشقی رجل منکم ما نقصوا من ملکی شیئا
اوکما قال یعنی اگر تمہارے جن وانس اگلے پچھلے خشک وترسب سے زیادہ شقی
جیسے بنجاویں تو بھی ہماری سلطنت میں کچھ نقصان نہیں آسکتا۔ بلکہ قرآن مجید
میں بھی ہے۔ ان تکفروا فان اللہ غنی عنکم یعنی کہ اگر تم نمک حرامی کرو۔ تو خدا کو
کچھ پرواہ نہیں۔ پس وہ تو ایسے غنی ہیں کہ نہ انہیں فرد کی پرواہ نہ افراد کی نہ کل کی
نہ آحاد کی اب اگر کوئی خدمت دین کی کرے۔ تو ناز کیسا۔ مگر باوجود اس کے اکثر کی
یہ حالت ہے کہ ذرا سا کام کیا اور اشتہاروں اور اخباروں میں اپنی مدح کے مضمون
دوسروں کے نام سے چھپوا رہے ہیں۔ بہرحال ہم کیا اور ہماری خدمت ہی کیا
اول تو جو خدمت ہے وہ بھی واقع میں انہیں کی توفیق سے ہے۔ اور پھر وہ اپنی
ذات میں بھی کسی قابل نہیں بالکل ایسی ہی ہے۔ جیسے ایک حکایت مولانا نے تحریر
فرمائی ہے کہ ایک مرتبہ عرب میں قحط پڑا اور پانی تک بالکل خشک ہوگیا ایک
بدوی تھا۔ اول تو وہ یوں بھی معاش نہ رکھتا تھا۔ پھر اس پر قحط کیوجہ سے اور بھی تنگی
میں مبتلا ہوگیا اسکی بیوی نے کہا آخر گھر میں کب تک بیٹھوگے کہیں نکلو کچھ کماؤ
اُسنے کہا جب مجھ کو کوئی ہنر نہیں آتا تو کہاں جاؤں۔ اور جاکر کیا کرونگا۔ بیوی نے
کہا خلیفہ بغداد کے پاس جاؤ اور حاجت پیش کرو۔ عرض حاجت کے لئے کسی ہنر
کی ضرورت نہیں اُسنے کہا یہ ٹھیک ہی مگر خود خلیفہ کے پاس جانیکے لئے کچھ تحفہ چاہیئے سو تحفہ کیا

یعنی مشارکت فی بعض الاوصاف کے دی ہیں بہر حال یہ معلوم ہوگیا کہ ہم کیا چیز
ہیں۔ اصل تو وہی ہیں جو سب کچھ کرا دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ خود ہی فرماتے ہیں
فسنیسرہ للیسریٰ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ جس کام کے لئے پیدا
کیا گیا ہے۔ وہی اس کے لئے آسان ہوجاتا ہے۔ پھر یہ آیت تائید میں پڑھی۔
فسنیسرہ للیسریٰ۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ نماز پڑھتے
ہیں ارادہ سے مگر ارادہ کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہوتی ہے وہ کیا تقاضا، داعیہ
اسی کی بدولت ارادہ میں کامیابی ہوتی ہے۔ اور وہ نہ ہو تو پھر دیکھ لیجئے عمل کرنے
میں کتنی مشکل ہوتی ہے۔ نماز کی فرضیت سن کے ارادہ تو کرلیا کہ نماز پڑھینگے
لیکن اگر تقاضا نہیں پیدا ہوا تو کبھی نہیں پابندی ہوگی۔ اور یہ تقاضا محض حق
تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت اور توفیق ہے۔ جب کامیابی بلا داعیہ کے کم ہوتی
ہے۔ اور داعیہ وہ پیدا کرتے ہیں تو بس وہی کام لیتے ہیں۔ جب وہ کام لیتے ہیں
تو پھر کام پر کبر و عجب کیسا۔ تو انّنی من المسلمین کا عربی الفاظ سے ترجمہ کیجئے۔
کہ میں مسلمین میں سے ہوں۔ اردو میں ترجمہ کیجئے کہ میں تو فرماں برداروں میں
سے ہوں۔ پھر انّنی مسلم نہیں فرمایا کہ اس میں تفرد کا شبہ ہوتا کیونکہ بڑے کا تو
غلام بننا بھی فخر ہے۔ تو اس صورت میں پھر شائبہ عجب کا رہتا کہ یہ شخص یہ سمجھتا
کہ تنہا میں ہی فرمانبردار ہوں۔ سبحان اللہ قرآن مجید میں بھی علوم کوٹ کوٹ کے
بھرے ہیں۔ تو انّنی من المسلمین میں ایک وجہ دلالت علی التواضع کی تو مادہ کے
اعتبار سے تھی اور ایک وجہ صیغہ کے اعتبار سے ہے کہ اس سے اشارہ اس
امر کی طرف کردیا کہ کام کرنے والے بہت ہیں۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں ایک ہی ہوں
کبھی نخرہ پیدا ہوتا کہ میں نہیں کرونگا۔ تو کام رک جائے گا۔ یہ لفظ بھی بتلا رہا ہے
کہ وہاں بہت سے غلام ہیں اگر ایک غلام نے فرمانبرداری نہ کی۔ تو اسنے اپنا ہی
کچھ کھویا۔ پھر اس جگہ تو ہر واحد کے اعتبار سے بتایا کہ ایک شخص کے چھوڑ دینے سے
ہمارا کام نہیں رک سکتا۔ اور ایک دوسرے مقام پر یہ بھی بتادیا۔ کہ ساری جماعت کی

پنکھا جھلتے تھے۔ مگر جھلنا جانتے نہ تھے۔ کبھی سر میں ماردیا کبھی کان میں لگ گیا۔ کبھی ٹوپی اڑادی۔ مگر چونکہ اون سے بے تکلفی نہ تھی۔ لحاظ کے مارے میں نے کچھ نہ کہا اور اتنی دیر تک صبر کیا۔ وہ اپنے دل میں یہ سمجھتے ہونگے کہ میں نے بڑا احسان کیا جو اتنی دیر تک پنکھا جھلا۔ اور میں یہ سمجھ رہا تھا کہ میں نے بڑا احسان کیا جو ان سے پنکھا جھلوالیا۔ اب دیکھ لیجئے کہ واقع میں احسان کس کا زیادہ ہے۔ سچ تو یہ ہی کہ احسان میرا ہی ہے۔ کہ اُن کی خاطر سے میں نے تکلیف برداشت کرلی۔ اور ناراضی ظاہر نہیں کی اسی طرح حق تعالیٰ کی عبادت کو آپ بڑی خدمت سمجھتے ہیں۔ اگر غور کیا جاوے تو خود ہماری وہ خدمت ہی اپند کے قابل نہیں۔ دیکھ لیجئے ہمارا کوئی روزہ اور کوئی نماز بھی مکروہات سے خالی ہے۔ پھر جو آپ کا یہ روزہ نماز انہوں نے لیا تو اُن کا احسان ہوا کہ اوس پر سزا نہیں دی تو اُن کی عنایت تو بھول گئے اپنا احسان جتانے لگے۔ تو انی من المسلمین میں متنبہ کردیا کہ خدمت پر نازمت کرنا ہمارے یہاں تم جیسے بہتیرے غلام پڑے ہیں۔ سعدی علیہ الرحمۃ نے ایک حکایت لکھی ہی کہ ؎

یکے روز بر بندۂ دل بسوخت | کہ بگفت و فرمانبرش میفروخت
ترا بندہ چوں من بیفتد بسے | مرا چوں تو خواجہ نباشد کسے

یعنی ایک شخص اپنا غلام بیچ رہا تھا اور غلام یہ کہہ رہا تھا کہ تجھکو مجھ جیسے تو بہت مل جائینگے مگر مجھکو تجھ جیسا آقا نہیں ملیگا۔ تو یہی ہماری نسبت خدا کے سامنے ہی ہے۔ نعوذ باللہ اگر یہ خدا کو چھوڑ دے تو خدا کہاں ملیگا۔ مگر خدا کو اسکی کیا پروا ایسے کھٹمل مچھر بھنگے رہے تو کیا نہ رہے تو کیا۔ جیسے کسی مکان کے متعلق کوئی بھنگا یوں کہنے لگے کہ ہمیں نے تو اس گھر کو آباد کر رکھا ہے جیسے ایک قصہ ہے۔ کہ کسی عطر فروش کی لڑکی چھیٹڑے والوں میں بیاہی گئی۔ ایک دن اتفاق سے ساس بہو میں لڑائی ہوئی ساس نے کہا کہ ایسی سست اور کاہل بہو سے پالا پڑا ہے کہ ہگے پرسے بھی نہیں ہلتی۔ بہو نے کہا واہ مجھے کاہل نہ کہنا میں نے تو اتنا بڑا کام کیا ہے کہ آج تک تم میں سے کسی سے بھی نہو سکا۔ ہاں صاحب وہ کیا صاحب وہ یہ کہ میرے آنے سے تمہارے

لیجاؤں کہنے لگی یہ گاؤں میں جو تالاب خشک ہو گیا ہے اور ایک گڑھے میں کچھ پانی رہ گیا ہے بس اسی کا پانی لیجاؤ۔ بھلا ایسا پانی خلیفہ کو کہاں نصیب وہ یہ سمجھتی تھی۔ کہ بغداد میں بھی ہمارے گاؤں کی طرح پانی نہ رہا ہوگا۔ سچ کہا۔ واقعی خلیفہ کو ایسا سڑا ہوا پانی کیوں ملنے لگا۔ غرض وہ پانی اسنے ایک گھڑے میں بھرا۔ یہ سر پر رکھکر سیدھا بغداد خلیفہ کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہاں پہونچا تو خلیفہ تک پہونچا یا گیا۔ سڑے ہوئے پانی کا گھڑا جسے بیوی نے خوب اچھی طرح بند ہی کر دیا تھا۔ یہ کہا ہوا خلیفہ کے سامنے پہونچا اور جاتے ہی گھڑا تخت پر خلیفہ کے رکھدیا۔ خلیفہ نے پوچھا یہ کیا ہے۔ کہنے لگا۔ ھذا ماء الجنۃ یہ جنت کا پانی ہے۔ خلیفہ نے حکم دیا کھولو۔ کھولا گیا تو سارا دربار سڑ گیا۔ مگر خلیفہ ایسا کریم النفس تھا کہ ناک بھوں بھی نہیں چڑھائی خلیفہ کی تہذیب کے اثر سے سارا دربار خاموش رہا۔ خلیفہ نے خدمت گار کو حکم دیا کہ لیجاؤ اسے ہمارے خاص خزانہ میں رکھو اور ان کا گھڑا خالی کرکے اشرفیوں سے بھر دو اور ان کی خوب خاطر مدارات کرو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جب رخصت کا وقت آیا حکم ہوا کہ واپسی میں انہیں دجلہ کے راستہ سے انکے گھر روانہ کرو۔ اشرفیوں سے گھر بھرا جاتا اولئک یبدل اللہ سیئاتھم حسنات کا تو مصداق تھا ہی مگر اسنے جو دجلہ دیکھا اور اس کے پانی کی لہریں اور ٹھنڈی ہوا انکا لطف نظر آیا۔ پھر تو اسپر گھڑوں پانی پڑ گیا کہ جس کے قبضہ میں اتنا بڑا دریا ہے۔ اس کے دربار میں ہمنے یہ ہدیہ پیش کیا بس اسی طرح ہماری آپ کی عبادت ہے۔ آپ جسوقت آخرت میں خزائن اعمال انبیاء کے دیکھینگے تو آپ کو اپنے اعمال پر نظر کرکے شرم آوے گی۔ تو ان اعمال پر ناز کا ہیکا۔ بلکہ وہاں تو اعمال کاملہ فاضلہ کا بھی یہی فیصلہ ہے۔ کہ ان اللہ لغنی عنکم خدا کو تمہاری کچھ حاجت نہیں۔ یہ تو انکی عنایت ہے۔ کہ ان اعمال کی توفیق دیدی تو ہمیں چاہیئے کہ ان کی نعمت توفیق پر نظر کریں نہ کہ اپنے عمل اور خدمت پر ؎

منت منہ کہ خدمت سلطان ہمیکنی　　منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

ایک اور واقعہ سے اس کی تفسیر اور بھی اچھی طرح سمجھ میں آ جائے گی۔ وہ یہ کہ ایک شخص جنگو

اور دواوسکے تکمیل یعنی عمل صالح اور تواضع وافتقار و اعتراف فرماں برداری ۔ یہ تین اجزاء ہیں اور کیسے مرتبط ہیں۔ اب اپنی حالت دیکھئے کہ اولاً تو دعوۃ الی اللہ کا باب ہی گم ہوگیا ہے۔ حتیٰ کہ جہاں قدرت ہے۔ وہاں بھی نہیں اور جہاں قدرت نہیں ہے۔ وہاں کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں ہے۔ ہمارے بزرگ تو وہ تھے کہ جہاں قدرت نہ تھی وہاں بھی دعوۃ الی الحق سے باز نہیں رہتے تھے۔ اور ہم ہیں کہ قدرت کی جگہ بھی نہیں کرتے۔ بیوی بچوں نوکروں کو باوجود قدرت کے ہم کبھی امر بالمعروف نہیں کرتے۔ مگر یہ برتاؤ صرف خدا کے معاملات میں ہے۔ اپنے معاملات میں ہرگز نہیں گھر میں آئینگے تو یہ پوچھینگے کہ کھانا تیار ہوا یا نہیں ہوا مگر یہ کبھی نہ پوچھینگے کہ بیوی نماز بھی پڑھی کہ نہیں۔ بہتیرے کہینگے کہ بیوی سے کہا تو تھا۔ مگر وہ نہ پڑھے تو کیا کریں۔ بھائی کہنے کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک مشورہ اور ایک حکم۔ ایک تو یہ کہنا کہ نماز پڑھا کرو۔ ہمیں نماز نہ پڑھنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ یہ تو مشورہ کی صورت ہے۔ کہ اس کی مخالفت سے بیوی کو ناراضی کا ڈر نہیں اور ایک یہ کہنا ہے کہ جیسے بیوی کھانے میں نمک تیز کر دے تو ایک دن تو نرمی سے کہینگے دوسرے دن سختی سے کہینگے۔ اور تیسرے دن جو ذرا اکھڑ ہیں وہ ڈنڈوں سے کہینگے تو یہ حکم کی صورت ہے۔ جس کی مخالفت سے بیوی کو ڈر ہوجاوے کہ میاں سخت ناراض ہونگے ذرا انصاف سے کہو کہ کیا نماز کو اسی طرح کہا تھا جس طرح نمک کو کہتے ہو۔ یوں کیوں نہیں کہتے کہ اگر نماز نہ پڑھوگی تو ہم تمہارے ہاتھ کی روٹی نہیں کھائینگے۔ اور ایسا ہی کرو بھی اور ڈرومت کہ روٹی نہ ملیگی۔ بہت سے بہت ایک ہی آدھ روز ایسا کرنا پڑیگا۔ پھر تو وہ پابندی ہوجائیگی۔ اور شہروں میں تو یہ سزا کچھ بھی مشکل نہیں پوری کچوری روٹی سالن سب بازار میں موجود ہے۔ البتہ قصبات میں ذرا دشواری ہے۔ مگر وہاں بھی کچھ دشواری نہیں۔ آخر جب بیوی مرجاتی ہے۔ تو نکاح ثانی تک برادری میں گھر گھر پکانیکے لئے آٹا گھومتا پھرتا ہے یا نہیں۔ اگر کہو کہ اگر ساری ہی عورتیں بے نمازی ہوں تو کیا کریں پھر کس سے پکوائیں۔ اسکا جواب یہ ہے کہ دنیا بھر تو تمہاری محکوم نہیں ہے تمہیں تو صرف اپنے گھر کیلئے

گھر کی ساری بدبو جاتی رہی۔ ورنہ پہلے گھر کیسا سڑا ہوا تھا۔ یعنی اب اُن کا دماغ بھی
اُس بدبو کا عادی ہو گیا تو یہ یہ سمجھیں کہ بدبو جاتی رہی۔ تو ایسے ہی ہم ہیں کہ غیر
خدمت کو خدمت سمجھ رہے ہیں ورنہ کیا ہماری خدمت تو انّنی من المسلمین کے
دو معنی ہو سکتے تھے ایک دعویٰ و فخر اور ایک تواضع۔ مگر یہاں تواضع مراد ہے۔ اور
اس کی تائید کہ ایک ہی لفظ دونوں معنی میں مستعمل ہو سکتا ہے خود قرآن مجید کے دوسرے
موقع سے بھی ہوتی ہے چنانچہ ایک جگہ مقبولین کی مدح میں اُن کا مقولہ ارشاد ہے
ربنا اننا سمعنا منادیا ینادی للایمان ان آمنوا بربکم۔ فآمنا ربنا فاغفر لنا ذنوبنا
وکفر عنا سیئاتنا یعنی اے اللہ ہم نے ایک منادی کو سُنا کہ وہ ایمان کے لئے ندا
دیتا ہے۔ کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ۔ فآمنا پس ہم ایمان لائے اے ہمارے پروردگار
پس بخش دیجئے ہمارے گناہ۔ اور دور کر دیجئے ہماری بُرائیاں ہم سے۔ یہاں تو آمنا
تواضع اور انکسار و افتقار کے لئے ہے۔ جسکو ذوق سلیم اور سیاق و سباق صاف
بتلا رہا ہے۔ اب دوسری آیت سنیئے جو اسی لفظ کو کبر و عجب کے طور پر استعمال
کرنے پر دال ہے۔ قالت الاعراب آمنا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا الآیہ
یہاں بھی وہی آمنا ہے۔ مگر یہاں اس کو رد کیا گیا جس کا سبب یہی ہے۔ کہ دعویٰ
اور فخر سے کہتے تھے چنانچہ بعد والی آیت اس پر صریح دال ہے چنانچہ ارشاد ہے یمنون
علیک ان اسلموا قل لا تمنوا علی اسلامکم بل اللہ یمن علیکم ان ھداکم
للایمان ان کنتم صادقین یعنی وہ لوگ آپ پر احسان رکھتے ہیں اپنے اسلام
لانے کا۔ فرما دیجئے کہ احسان نہ رکھو مجھ پر اپنے اسلام کا۔ بلکہ خدا کا احسان ہے۔ کہ
اُسنے تمہیں ایمان کی ہدایت کر دی۔ بشرطیکہ تم اس قول میں سچے ہو غرض تو
دیکھئے یہاں اُن کا آمنا کہنا دعویٰ اور فخر کے طور پر تھا۔ اُس کے جواب سے
صاف طور پر معلوم ہو گیا کہ واقعی خدا کا احسان ہے جو اُسنے ہمیں نیک کام کی
ہدایت کر دی۔ اسی طرح یہاں بھی فرمایا وقال اننی من المسلمین تو ایک تکمیل
دعوۃ الی اللہ کی یہ ہوئی۔ تو اب کل تین چیزیں ہوئیں۔ ایک مقصود یعنی دعوۃ الی اللہ

ادا ہو جاتی ہے [illegible] ہو جاتی ہے۔ تو میت کو روبرو رکھکر چار مرتبہ اللہ اکبر اللہ اکبر کہہ کے [illegible] نماز ہو گئی۔ ان ظالموں نے بجائے قدر کرنے کے اعتراض [illegible] نماز بتلائی۔ یہ تو ہم نے کبھی سنا ہی نہ تھا۔ یہ خوب جانوں نے سمجھ لیا ہے کہ ہم نے کبھی نہیں سنا۔ ارے کیا سب مسئلے تمہارے سننے ہی میں آنا ضروری ہیں۔ اگر سب مسئلے سن لیتے تو تم بھی عالم ہی ہو جاتے۔ جیسے کوئی یہی کہے کہ حلوائی بڑا بیوقوف ہے۔ اسنے فضول اسقدر لڈو بنا ڈالے۔ ارے میرے پیٹ بھرنیکو تو ایک جلیبی کا شیرہ ہی کافی تھا۔ اسی طرح جو چیز ان کی سنی ہوئی ہو بس وہ فضول ہے۔ اور جو چیز انکے علم سے خارج ہو۔ بس وہ مسئلہ ہی نہیں ہے۔ خیر یہ کلام تو استطرادی تھا میں یہ کہہ رہا تھا۔ کہ ان بزرگ کے خلوص کی برکت سے خدا نے ہندو کو کیسا مسلمان کر دیا۔ اسی طرح آپ کو بھی خلوص کی ضرورت ہے۔ انشاء اللہ پھر سب کی سب نمازی ہو کر روٹیاں پکا پکا کر کھلائینگی۔ پہلے امتحان۔ تو دو پھر نتیجہ نکلیگا گو قدرے مشقت برداشت کرنی پڑے گی۔ اس پر بطور لطیفہ کے ایک شخص کا قصہ یاد آیا۔ کہ انہوں نے کسی واعظ سے سن لیا کہ سب کو خدا دیتا ہے۔ خدا ہی پر توکل اور بھروسہ رکھنا چاہیئے بس یہ سنکر جنگل میں جا بیٹھے کہ اب ہم بھی توکل [illegible]۔ کیا خوب سمجھے توکل کو اب ایک وقت گزرا دوسرا وقت گزرا۔ کہیں کھانے کا پتہ نہیں۔ وہاں ایک کنواں بھی تھا۔ اتفاقاً ایک مسافر آیا کنوے پر بیٹھا اور سڑک کی طرف منھ کرکے بیٹھا انکی طرف منھ بھی نہیں کیا۔ اور کھایا پیا چلتا ہوا۔ دوسرا آیا وہ بھی کھاپی کر چلا وہ چلا اب [illegible] وقت گزر گئے اور انہیں بھوک کی تاب نہ رہی۔ تو سوچا کیا کروں آخر ایک [illegible] مسافر [illegible] بیٹھا اور وہ بھی جب کھانے پینے کو ہوا تو ان متوکل نے کھنکھارا اسنے منھ پھیر کر دیکھا تو بہت پریشان صورت اسکو ترس آیا اور روٹیاں حوالہ [illegible] مولوی صاحب کے پاس پہونچے۔ اور کہنے لگے کہ آپنے وعظ [illegible] بیان کیا وہ بہت ٹھیک ہے مگر اس میں ایک بات چھوڑ دی

کہا جا رہا ہے۔ اور اگر ہمت ہو تو سب کے ہی ساتھ یہ معاملہ کرو انشاء اللہ تعالیٰ تمہاری ہمت کی برکت سے ساری کی ساری ہی نمازی بن جاوینگی۔ اس ہمت کی برکت پر ایک حکایت یاد آئی کہ ایک بزرگ تھے۔ کہ لمبے سفر میں تو نماز و جماعت کے خیال سے ایک دو آدمی کو ہمراہ رکھتے تھے اور چھوٹے سفر میں ایسے انداز سے سفر کرتے تھے۔ کہ نماز کے وقت منزل پر پہونچ جاویں۔ اتفاق سے ایک چھوٹے سفر میں راستہ میں کچھ حرج ہو گیا۔ اور ظہر کا وقت آگیا۔ گاڑی بان ہندو تھا۔ اُنہوں نے وضو کیا سنتیں پڑھیں۔ کوئی اور نمازی نہ دکھائی دیا۔ انہوں نے دعا مانگی۔ کہ اے اللہ ہمیشہ میں جماعت سے نماز پڑھتا ہوں۔ اور اس وقت میں مجبور ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو اس وقت بھی جماعت سے مشرف کر سکتے ہیں مصلی بچھا کے یہ دعا ہی کر رہے تھے کہ گاڑی بان سامنے آیا کہ میاں مجھے تم مسلمان کر لو۔ بڑی مسرت ہوئی سمجھ گئے کہ دعا قبول ہو گئی۔ کیا پوچھنا ہے اس مسرت کا۔ وجد ہو رہا ہو گا۔ اسی وقت مسلمان کیا اور وضو کرا کر کہا کہ جس طرح میں کروں اسی طرح تو بھی کر اور سب ارکان میں سبحان اللہ سبحان اللہ کہتا رہ۔ دیکھئے یہ برکت تھی ہمت کی اور اس طرح محض سبحان اللہ سبحان اللہ سے ہماری نماز تو نہیں ہو گی۔ مگر نو مسلم کی ہو جاویگی جب تک اسے سورتیں اور دعائیں یاد نہوں جتنی جتنی یاد ہوتی جائیں اتنی اتنی اُسے بھی پڑھنا واجب ہو گا۔ اور بقیہ مواقع میں سے جس موقع کی دعا یا ذکر یاد نہوئی وہاں سبحان اللہ سبحان اللہ کہہ لینا کافی ہو گا۔ دیکھئے شریعت نہایت آسان ہے مجبوری میں زبردستی نہیں ہے۔ آسان پر یاد آیا کہ بعض دیہات میں استعداد کی کمی ہے۔ کہ کوئی جنازہ کی نماز تک نہیں جانتا۔ ایک جگہ کی مستفق کی ... معلوم ہوا کہ جنازہ کو بے نماز پڑھے دفن کر دیا۔ یہ سن کے میرا بہت دل دکھا میں نے انکی آسانی کے لئے شریعت کا مسئلہ عام مجمع میں ظاہر کیا کہ جب تک جنازہ کی نماز کی دعا یاد نہو اس ترکیب سے جنازہ کی نماز پڑھ لیا کرو۔ کہ وضو استقبال قبلہ اور حضور میت تو شرط ہے اور سب سہل ہیں۔ مگر ارکان صرف تکبیرات اربعہ ہیں۔ اور شرط کے بعد رکن کے

کہ فرما دیجئے یہ میرا راستہ ہے بلاتا ہوں میں اللہ کی طرف بصیرت پر ہو کر میں اور جتنے میرے متبع ہیں۔ اور حق تعالیٰ تمام برائیوں سے پاک ہیں۔ اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔ دیکھئے یہاں پر مطلقاً ومن اتبعنی ہے۔ یعنی جتنے میرے متبع ہیں سب حق کی طرف بلاتے ہیں۔ اس میں عموم ہے۔ اس خصوص اور اس عموم سے معلوم ہوا کہ اس کے درجات ومراتب ہیں۔ ایک درجہ کا پہلی آیت میں ذکر ہے اور ایک درجہ کا دوسری آیت میں۔ اور وہ درجات دو ہیں۔ ایک دعوت عامہ۔ ایک دعوت خاصہ پھر دعوت عامہ کی دو قسمیں ہیں ایک دعوۃ حقیقیہ اور ایک دعوۃ حکمیہ۔ دعوۃ حکمیہ وہ جو کہ معین ہو دعوۃ حقیقیہ میں۔ میں نے آسانی کے لئے یہ لقب تجویز کئے ہیں ان میں اصل دو ہی قسمیں ہیں دعوۃ الی اللہ کی۔ دعوۃ عامہ۔ دعوۃ خاصہ۔ اور ایک قسم معین ہے۔ دعوۃ عامہ کی تو اسی طرح یہ کل تین قسمیں ہوگئیں۔ تو ہر شخص کے متعلق جداجدا مرتبہ کے لحاظ سے ایک ایک دعوۃ ہوگی۔ چنانچہ دعوۃ خاصہ ہر مسلمان کے ذمہ ہے اور وہ یہ ہے جس میں خطاب خاص ہو اپنے اہل وعیال کو دوست احباب کو اور جہاں جہاں قدرت ہو اور خود اپنے نفس کو بھی۔ چنانچہ حدیث میں ہے۔ کلکم راع وکلکم مسئول کہ تم میں کا ہر ایک راعی (نگراں) ہے اور تم میں کا ہر ایک (قیامت میں) پوچھا جائیگا کہ رعیت کے ساتھ کیا کیا یہ دعوۃ خاصہ ہے۔ اور قرآن میں بھی اس کا ذکر ہے۔ یا ایہا الذین آمنوا قوا انفسکم واھلیکم نارا اے ایمان والو اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو عذاب دوزخ سے بچاؤ۔ یہ بھی دعوۃ خاصہ ہے کہ اپنے اہل وعیال کو عذاب دوزخ سے بچانے کا حکم ہے سو اس کا تو ہر شخص کو اپنے گھر میں اور تعلقات کے محل میں اہتمام کرنا چاہئے۔ اور ایک دعوۃ عامہ ہے جس میں خطاب عام ہو یہ کام ہے مقتداؤں کا جیسا کہ ولتکن منکم امۃ الآیۃ سے معلوم ہو رہا ہے۔ اور اس تفصیل میں ایک راز ہے وہ یہ کہ دعوۃ عامہ (یعنی وعظ) اسی وقت مؤثر ہوتی ہے کہ جب مخاطب کے قلب میں داعی کی وقعت ہو۔ بلکہ مطلق دعوۃ میں بھی اگر داعی کی وقعت نہ ہو تو وہ مؤثر نہیں ہوتی

وہ یہ کہ کھنکھارنا بھی پڑتا ہے۔ تو یہ کیسا وعظ ہے۔ کہ ایک بات کہی۔ اور ایک بات چھوڑدی جس سے عمل کرنے والے کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑیگا۔ تو حضرت پہلے امتحان تو دیجئے۔ پھر ثمرہ دیکھئے یہ دشواریاں تو امتحان کی ہیں جب امتحان میں کامیاب ہوگئے۔ تو پھر انعام ہو غرض امر بالمعروف میں کچھ مشقتیں بھی پیش آتی ہیں اُن کو سہو انشاءاللہ تعالیٰ برکت ہوگی۔ مگر ہم نے تو اسکو سترک ہی کردیا یہ تو بی بی کو نماز کا حکم کرنے کا ذکر تھا۔ اسی طرح اولاد کو نہ نماز پر کچھ کہتے ہیں نہ اور احکام پر ہاں اگر بچہ اسکول میں فیل ہوجائے تو آپ اُسکو بیحد ملامت کرتے ہیں اور اسی ملامت کے خیال سے بچے بھی خوب محنت کرتے ہیں۔ اور ملامت بھی اسدرجہ کی کرتے ہیں۔ کہ اوس کا تحمل کرکے بعضے اسی ندامت میں جان تک دیدیتے ہیں۔ چنانچہ یہاں کانپور ہی کا واقعہ ہے۔ کہ ایک لڑکا فیل ہوگیا تھا جاکے ریل کی پٹری پر لیٹ گیا۔ ریل آئی کٹ گیا۔ اسی طرح ایک لڑکے نے اٹاوہ میں افیون کھاکے جان دےدی تھی یہ تو اسکول کے امتحان کی مقصودیت کی کیفیت ہے۔ لیکن اگر صاحبزادہ نماز پہ نماز قضا کرتے چلے جائیں تو اباجان مارے محبت کے کبھی کچھ نہ کہینگے۔ الغرض دعوۃ الی اللہ کا اہتمام ہی قلوب سے نکل گیا۔ اب سمجھئے اس دعوۃ کے بھی درجے مختلف ہیں جو جس درجہ کا اہل ہو ویسا ہی اہتمام کرے۔ یہ ضروری نہیں۔ کہ ہر شخص سب درجوں کا اہتمام کرے۔ اس کا پتہ اس آیت سے چلتا ہے ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر فرماتے ہیں تمہارے اندر ایک ایسی جماعت ہونی چاہیئے جو دعوۃ الی الخیر کرے اور امر بالمعروف کرے اور نہی عن المنکر کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ایک خاص جماعت کا کام ہے۔ ساری امت کا کام نہیں ہے۔ اور دعوۃ الی الخیر اور دعوۃ الی اللہ کے ایک ہی معنی ہیں۔ سو اس میں تو اس کو صرف ایک خاص جماعت کا کام فرمایا گیا ہے اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے۔ قل ھذہ سبیلی ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا ومن اتبعنی وسبحان اللہ وما انا من المشرکین

ایک قصہ یاد آیا ایک طالب علم تھا کتابیں پڑھ کے اپنے گھر چلا تو اُستاد سے پوچھا کہ حضرت یہ تو آپ جانتے ہیں کہ مجھے آتا جاتا خاک بھی نہیں۔ مگر وہاں لوگ عالم سمجھ کے مسائل پوچھینگے تو کیا کرونگا۔ اُستاد تھے بڑے ذہن اُنہوں نے کہا کہ ہر سوال کے جواب میں یہ کہدیا کرنا۔ کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ اور واقع میں کوئی مسئلہ مشکل سے ایسا ہوگا جس میں اختلاف نہو سوائے عقائد توحید رسالت وغیرہ کے۔ تو ہر بات کا یہی ایک جواب دیدینا کہ اس میں اختلاف ہے جیسے تھیٹر میں ایک شخص نے اشتہار دیا تھا کہ آج ایک نیا تماشا ہوگا کہ حاضرین کسی علم اور کسی فن کا ہو سوال کریں ہم اس کا جواب دینگے۔ بس جناب لوگ بڑے بڑے مشکل سوال چھانٹ کے تھیٹر پہونچے۔ کوئی عربی میں کوئی انگریزی میں کوئی اردو فارسی میں غرض ہر زبان میں ہر فن کے سوالات ذہن میں لیکر پہونچے۔ وہ حضرت پلیٹ فارم پر تشریف لائے اور سب کے سوالات باری باری سننا شروع کئے ساری رات ان سوالات ہی میں ختم ہوگئی۔ اور سوالات بھی ختم ہوئے تو آپ نے کہا سنیئے صاحب سوالات کا وقت ختم ہوگیا۔ اب میرا جواب سنیئے لوگ نہایت اشتیاق سے متوجہ ہوئے آپ فرماتے ہیں کہ وہ جواب یہ ہے۔ کہ مجھے کسی کا بھی جواب معلوم نہیں۔ کیوں صاحب کیسا ٹھیک جواب ہے کہ نہ تو اس پر کوئی خدشہ وارد ہوتا ہے۔ نہ کسی اعتراض کی گنجائش ہے اور ہر سوال پر منطبق لوگ بیچارے جھنجلا کے اپنے اپنے گھر چلے گئے کہ مفت میں نیند بھی خراب ہوئی اور ٹکٹ کے دام بھی گئے۔ ایسے ہی اُنہوں نے ہر سوال کے جواب کیلئے یہ یاد کرلیا۔ کہ اس میں اختلاف ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں لوگوں میں انکی ہیبت بیٹھ گئی کہ بڑا عالم متبحر ہے بڑا وسیع النظر ہے۔ مگر فوق کل ذی علم علیم۔ کوئی صاحب پرکھ گئے کہ اسنے سب کو بنا رکھا ہے۔ آکر کہا مولانا مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔ اُنہوں نے کہا فرمائیے۔ کہا کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ اس میں آپ کی کیا تحقیق ہے۔ کہنے لگے اس میں اختلاف ہے بس آپ کی قلعی کھل گئی۔ تو غرض ایسی ترکیب ٹالدینے کی وقت سمجھ میں نہیں آتی ایسے ہی کسی نے ایک معقولی طالب علم سے مسئلہ پوچھا۔

تو عام دعوت میں عام مخاطبین کے قلب میں داعی کی وقعت ہونا چاہیئے۔ اور ظاہر ہے کہ بجز مقتدا کے کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو عام لوگوں کے دل پر اثر ڈال سکے اور ایسے لوگ کتنے ہوتے ہیں جو یہ سمجھتے ہوں کہ انظر الی ما قال ولا تنظر الی من قال۔ اور یہ سمجھتے ہوں کہ ؎

مرد باید کہ گیرد اندر گوش ورنبشت است پند بر دیوار

تو ایسے لوگ تو بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ ورنہ عموماً یہ دیکھتے ہیں کہ واعظ یا داعی باوقعت ہے یا نہیں۔ اگر وقعت نہیں ہوتی تو یہ شبہہ ہو جاتا ہے کہ جب آکر برابر کا ہو کے ہم کو نصیحت کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمتع چاہتا ہے۔ اور ہم سے بڑا بننا چاہتا ہے اور واقع میں اکثر ہوتا بھی یہی ہے۔ اس وجہ سے دعوۃ عامہ میں مقتدا ہونے کی ضرورت ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ امامت کبری میں حدیث الائمۃ من قریش میں قریش کی خصوصیت کی گئی ہے۔ اس میں بھی یہی حکمت ہے کہ چونکہ قریشی خاندانی ہیں ان کی ماتحتی سے کسیکو عار نہیں ہو گی اسی نص سے استناد کرکے باجماع صحابہ امامت کبری انہیں کے لئے مخصوص کر دی گئی۔ اور یہی راز ہے کہ انبیاء علیہم السلام نہایت عالی خاندان ہوئے ہیں۔ وجہ یہ کہ نبی بھی امام عام ہوتا ہے۔ اگر چھوٹے خاندان کا کوئی نبی ہوتا تو جو مدعی شرافت کے تھے وہ بوجہ کبر کے اُسے خاطر میں نہ لاتے اسی لئے تمام انبیاء عالی خاندان ہوئے۔ اسی طرح دعوۃ عامہ میں داعی کو بھی مقتدا ہونا چاہیئے جس کے لئے عالم ہونا بھی لازم ہے۔ دوسرے۔ اس لئے بھی مقتدا اور عالم ہونیکی ضرورت ہے۔ کہ خطاب عام کرتا ہوا یعنی وعظ کہتا ہوا دیکھکر لوگ یہی سمجھینگے کہ یہ دین کے مقتدا اور عالم ہیں اور یہ سمجھ کے ان سے شرعی اور فقہی مسائل پوچھینگے اور یہاں مسائل کے نام صفر ہوگا اور اتنی ہمت نہ ہوگی۔ کہ کہدیں کہ ہم کو معلوم نہیں۔ اور ہر وقت ایسی ترکیب سمجھ میں نہیں آتی کہ ٹالدیا کریں۔ لامحالہ اس حدیث کا مضمون واقع ہوگا۔ فافتوا بغیر علم فضلوا و اضلوا یعنی بغیر علم کے جو جی میں آئیگا فتوی دینگے تو خود بھی گمراہ ہونگے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرینگے۔ اور ٹالنے کی ترکیب

دوسرے کے مذہب پر پوری نظر ہونیکی ضرورت نہیں۔ اور جواب الزامی کے لئے اپنے مذہب
کے ساتھ ساتھ دوسرے کے مذہب پر بھی پوری نظر ضروری ہے۔ اب اس اعتبار سے داعی
دو قسم کے ہوئے۔ ایک وہ جو اپنے مذہب پر پوری نظر رکھتے ہیں اور دوسرے وہ کہ دوسرے
مذہب پر پوری نظر رکھتے ہیں۔ چونکہ اس وقت مناظرہ میں مخالفین کے مقابلہ میں الزامی
جواب زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ اس لئے داعین میں جو جماعت دوسرے مذہب پر نظر رکھتی ہو
وہ مخالفین سے مناظرہ کرے اُن کی یہی دعوت ہے۔ اور جو اپنے مذہب پر پوری نظر رکھتی ہو
اُسے چاہیئے کہ وعظ و تلقین اپنے ہم مذہب والوں کو کرے۔ تو اس بناء پر داعین کی دو
جماعتیں ہوئیں ایک واعظین کہ جو اپنے مذہب والونکو تحقیق سے متنبہ کیا کریں۔ اور
ایک مناظرین کہ جو الزامی جواب سے مخالفین کو ساکت کیا کریں۔ کیونکہ جواب تحقیقی
مسلمانوں کو زیادہ نافع ہونگے۔ اور الزامی غیر مذہب والوں کو زیادہ مفید ہونگے
اور اُن لوگوں کو بھی مفید ہونگے جو مائل ہیں غیر مذہب کی طرف۔ خلاصہ یہ کہ خطاب خاص
تو سب کو یکساں اپنے اپنے گھروں میں کرنا چاہیئے۔ اور خطاب عام میں ایک تو ایسے لوگ
ہوں کہ وعظ کہا کریں۔ جو اہل اسلام کے مناسب ہو تاکہ مسلمانوں کی اصلاح ہو
اور ایک وہ ہوں جو ایسے لوگوں کے مقابلہ میں تبلیغ کریں۔ جن کو اسلام پر شبہہ ہوگیا ہو
یا اسلام سے تعلق کم ہوگیا ہو یا وہ غیر مسلم ہوں تاکہ اسلام کی طرف آجاویں۔ اب اس
جماعت داعین عامہ کی کچھ ضروریات بشریہ بھی ہونگے اسلئے انکے علاوہ ایک اور جماعت
مسلمانوں کی ایسی ہونی چاہیئے جو اس جماعت کی ضروریات مہیا کریں۔ اور مبلغین کیلئے
سامان جمع کریں تاکہ وہ اپنے فرض منصبی میں بیفکری سے مشغول ہوسکیں۔ اب
چونکہ سرے سے دعوۃ الی اللہ ہی کا اہتمام نہیں ہے۔ اسلئے کوئی جماعت بھی نہیں ہے
نہ دعوۃ خاصہ والی کہ اپنے گھروں میں اصلاح کریں نہ دعوت عامہ کی کہ اپنے بھائیوں کی
فکر کریں۔ یا جو تذبذب میں پڑ گئے ہیں۔ اُن کی خبر لیں۔ جو کہ ایک اعتبار سے اپنے
بھائیوں سے بھی زیادہ قابل توجہ ہیں۔ کیونکہ جو اپنے بھائی ہیں وہ تو آپ آکر اپنی ضروریات
پوچھ لینگے۔ مگر جو مذبذبین ہیں اُنکے تو گھر پر ہمیں جانا ہوگا۔ اور خاصکر اسوقت جبکہ دوسرے لوگ

کہ گلہری کنوئیں میں گر پڑی ہے. پاک کرنیکے لئے کتنے ڈول نکلوا دیں یہ بیچارے
نری معقول جانتے تھے فقہ کی خبر نہ تھی۔ اب آپنے اپنا جہل چھپانے کے لئے اُس سے
پوچھا کہ گلہری جو گری ہے دو حال سے خالی نہیں یا خود گری یا کسی نے گرادی۔ پھر اگر
خود گری ہے تو دو حال سے خالی نہیں دوڑ کے گری یا آہستہ گری۔ اور اگر کسی نے گرائی
ہے تو دو حال سے خالی نہیں یا آدمی نے گرائی یا جانور نے اور ہر ایک کا جدا حکم ہے تو اب
تبلاؤ کیا صورت ہوئی سائل نے پریشان ہوکر کہا کہ صاحب اسکی تو خبر نہیں کہنے لگے پھر
کیا جواب دیں اور یہ جھوٹ بولا کہ ہر شق کا جدا حکم ہے جدا حکم کیا ہوتا سب کا حکم ایک
ہی ہے۔ وہ بیچارہ گھبرا کے چلدیا کہ انکی منطق کا کیا جواب دے۔ تو یہ محض ترکیبیں ہیں اور
یہ بھی بعضوں کو تو آتی ہیں۔ اور بعضوں کو نہیں آتیں جسے نہیں آتیں وہ کیا کریگا
کہ غلط سلط مسئلہ بتادیگا۔ یہ خرابی ہوگی۔ جاہل کے داعی عامہ یعنی واعظ بننے میں
اسلئے فرمایا کہ ولتکن منکم امۃ الآیۃ کہ تم سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیئے
یہ سب گفتگو خطاب عامہ میں ہے۔ بہرحال جنکو خطاب عام کی اہلیت حاصل ہے وہ خطاب
عام کریں ورنہ خطاب خاص پھر خطاب عام کی دو قسمیں ہیں ایک حقیقی۔ ایک حکمی
حقیقی یہ کہ مخاطبین کو خواہ اہل اسلام ہوں یا غیر اہل اسلام اُن کو وعظ سنادے۔ اور
حکمی یہ کہ تبلیغ ونشر کرنے والوں کی اعانت کرے تاکہ وہ حوائج سے مستغنی ہوکر تبلیغ کرسکیں
تو یہ اعانت بھی مقصود کی ساتھ ملحق ہوگی۔ اسی لئے اسکو دعوۃ حکمی کہا۔ یہ اقسام تو باعتبار
دعوۃ کے عموم وخصوص یا مقصودیت والحاق تھے۔ اب باعتبار نوع دعوت کے
داعی کی اور دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ ہے جو جواب تحقیقی سے دعوت کرسکتا ہے۔ اور ایک
وہ ہے جو جواب الزامی سے دعوت کرسکتا ہے۔ جواب تحقیقی کے یہ معنی ہیں کہ کسی نے
جو کچھ پوچھا جواب میں اُس کی حقیقت کو واضح کردیا۔ اور جواب الزامی کے یہ معنی ہیں کہ جو
اعتراض ہم پر کسی نے کیا ہم نے ویسا ہی اعتراض اُس کے مذہب پر کردیا کہ جو جواب تم ہمیں
دوگے بعینہ وہی جواب ہماری طرف سے تمہارے اعتراض کا ہوگا۔ اب ان دونوں میں
سے ہر ایک کے لوازم وشرائط کو سمجھنا چاہیئے۔ جواب تحقیقی کیلئے اپنے مذہب پر پورا عبور ہونیکی ضرورت ہے

کہ کسی میدان میں بہت سے مقتول پڑے تھے اُن میں ایک زخمی بھی تھا۔ رات آتی ہوئی دیکھکر اکیلے
مُردوں میں پڑے پڑے اسکا جی گھبرایا کہ اندھیری رات مردوں کا ڈھیر نہ کسی سے بات کہ نہ چیت
کے۔ ادہر سے جو آدمی نکلتا ہے۔ یہ اوسکو بلاتا ہے۔ مگر کوئی نہیں آتا اور واقعی اس بھیانک منظر میں
کون ٹھہرے۔ اتفاق سے ایک بنیا آتا ہوا معلوم ہوا اُسنے دور سے پکارا لالہ جی لالہ جی! آواز
سُنکر لگا بھاگنے سمجھا کہ کوئی بھوت ہے مگر کئی بار کے پکارنے میں دور ہی سے بولا کیا ہے اُسنے کہا
میاں ڈرو مت ادہر آؤ۔ میری کمر میں ایک ہمیانی روپوں کی بندھی ہے اُسے کھول کر تم لیجاؤ نہیں
تو میں مرجاؤنگا اور معلوم نہیں کسکے ہاتھ آویگی یہ لوگ ہوتے ہیں لالچی ٹھہر گیا اور ڈرتے ڈرتے آگے
بڑھا جب نزدیک پہونچا تو اُسنے کمر سے تلوار نکالکے پیروں پر اس زور سے ایک ہاتھ دیا کہ ٹانگیں کٹ گئیں
مگر لالچ میں پھر بھی ہمیانی ٹٹولی وہاں کچھ بھی نہیں کہنے لگا ارے یہ کیا کیا؟ اُسنے کہا کہ کیا کیا
جی گھبراتا تھا جسکو بلاتے تھے کوئی ٹھہرتا نہ تھا۔ اس ترکیب سے تم کو اپنے پاس رات کو رکھا ہے
اب ہم تم ملکے باتیں کرینگے۔ تو لالہ جی کیا کہتے ہیں واہ بے اُوت کے اُوت مکا مکانہ آپ چلے نہ
اور کو چلنے دی۔ تو یہی حالت ہماری ہے کہ نہ آپ کام کریں اور نہ کسی کام کرنے والے کو کرنے دیں
عیب نکالتے ہیں کہ یہ تو بدمذہب ہے بدعقیدہ ہے اگر اُسنے کسیکو مسلمان بنالیا تو وہ ایسا ہی
ہوگا جیسا یہ پھر ایسا مسلمان بنانے سے کیا فائدہ۔ ارے بھائی مسلمان تو بنالینے دو۔ پھر تم
جاکے اپنے عقائد سکھا دینا۔ بہرحال اتفاق کے ساتھ دعوۃ الی الاسلام کا کام کرنا نہایت
اہم اور ضروری ہے۔ اور نہایت اہم ہونیکا یہ مطلب نہیں کہ اور سب شعبے دعوۃ کے چھوڑ دو
سب کرو۔ اور اس کام کیلئے جنہیں مناظرہ میں مہارت ہو وہ زیادہ موزوں ہونگے انہیں
منتخب کر لو۔ اور جو لوگ غیر مذہب کا علم نہیں رکھتے انہیں مسلمانوں کے اخلاق کی اصلاح
کیلئے رہنے دو۔ اور جو بے علم ہیں کہ نہ اپنے مذہب پر نظر ہے نہ دوسرے کے مذہب پر وہ دعوۃ
حکمیہ کریں یعنی مبلغین کیلئے سرمایہ جمع کریں۔ تاکہ اُس سرمایہ سے یہ کام کئے جاویں۔ یعنی
ضروری چھوٹی چھوٹی کتابیں چھاپ کر اون لوگوں میں بانٹی جائیں۔ اور قرآن اور
روزمرہ کی ضروریات دین کے مدرسے قائم کئے جائیں۔ مبلغین کی تنخواہیں دیجاویں۔ اگر
اس ترکیب سے انتظام کیا جاویگا۔ تو نئی نسل تو یقیناً اچھی ہوگی نہ نہیں صحیح تو دین سے

انہیں اسلام سے ہٹانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ چنانچہ اس وقت بھی آپنے سُنا ہوگا کہ آگرہ
وکانپور وغیرہ کے اطراف میں ایک جماعت نومسلموں کی ہے۔ وہ مخالفین کے اغوا سے
اسلام سے نکل رہے ہیں۔ افسوس دوسروں کو تو ہم اپنے مذہب میں کیا لاتے اپنے ہی
بھائیوں کو اپنے مذہب میں نہیں رکھ سکتے۔ خدانخواستہ اگر یہی نوبت رہی تو آج تو نومسلموں
پر مشق ہے۔ اگر مخالفین کا حوصلہ بڑھ گیا تو کل وہ پورانے مسلمانوں کو بھی اپنی طرف کھینچنے
کی کوشش کرینگے۔ (عیاذاً باللہ) چنانچہ آپ نے قصے سنے ہونگے کہ بعض پورانے مسلمان
عیسائی ہوگئے۔ آریہ ہوگئے۔ اگرچہ وہ چند ہی ہیں اور طمع زر یا طمع زن ہی سے ہی
مگر ہمارے رونے کے لئے تو ایک بھائی کا کم ہوجانا بھی کافی ہے۔ تو اگر ان مغوین کو
ان نومسلموں کے بارہ میں خدانخواستہ کامیابی ہوگئی۔ تو اندیشہ ہے کہ وہ ہماری طرف بھی
متوجہ ہونگے۔ مگر ان سب تدابیر میں سخت ضرورت باہمی اتفاق کی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ
مسلمانوں میں جہل کے ساتھ نااتفاقی بھی حد درجہ کی ہے۔ اس حسد اور نااتفاقی کی
بدولت اپنا آپ نقصان کئے لیتے ہیں۔ غضب تو یہ ہو رہا ہے۔ کہ بعضے مبلغین دوسری
جماعت مبلغین کی مذمت کرکے ان ناواقف بےخبر نومسلموں کو اُن کا اتباع کرنے سے
روک رہے ہیں بھائی اس وقت تو مشترک تعلیم اسلام کی ضرورت ہے عقائد و فروع کا
اختلاف پھر دیکھا جاویگا یا تعلیم اسلام میں بھی دو حیثیت ہیں میرا سکھلایا ہوا اسلام حق
اور دوسرے کا سکھلایا ہوا باطل جیسے کہ دو طالب علم تھے۔ اور دونوں سگے بھائی تھے۔ آپس
میں لڑے اور ایک نے دوسرے کو ماں کی گالی دی۔ کسی نے کہا کہ ارے کمبخت وہ تیری
بھی تو ماں ہے۔ تو کہنے لگا کہ اس میں دو حیثیت ہیں ایک یہ کہ میری ماں ہے۔ اس
حیثیت سے تو معظمہ مکرمہ۔ اور ایک یہ کہ وہ اُس کی ماں ہے اس حیثیت سے وہ ایسی
اور ویسی۔ تو کیا اسلام میں بھی دو حیثیتیں بنالیں۔ ایک یہ کہ میں سکھاؤں۔ اس
حیثیت سے اسلام برحق ہے۔ ایک یہ کہ تو سکھاوے اس حیثیت سے برحق نہیں۔ اگر
یہ ہے تو خیر تم ہی اسلام سکھاؤ۔ لیکن اگر خود ہمت نہو۔ تو دوسروں کو سکھلانے دو۔ یہ کیا
خرافات ہے کہ نہ خود سکھاؤ اور نہ کسی اور کو سکھانے دو۔ اسپر [illegible]

گھر میں تو یزید ہیں اور پلیٹ فارم پر بایزید۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے کاموں میں فلاح نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ قیامت کب آویگی۔ آپ نے فرمایا جب کام غیر اہل کے سپرد ہوگا۔ میں خادمان اسلام کو خدمت چھوڑنیکے لئے نہیں کہتا۔ بلکہ یہ کہتا ہوں کہ وہ خود بھی عمل صالح کے پابند ہو جاویں۔ مگر ریاء سے نہیں کہ مجمع کو دکھانیکو نماز پڑھ لی۔ یا گھر میں بھی پڑھی۔ مگر اس خیال سے کہ لوگ سنینگے تو کیا کہیں گے پھر جب اُس خدمت کے عہدہ سے استعفا دیا اللہ میاں کو بھی نماز سے استعفا دیا جیسے ایک گنوار کی بھینس مرگئی تو جھٹ سے روزہ توڑ دیا کہ لے اور روزہ رکھوا لے۔ نعوذ باللہ۔ ایک نقلم یہ ایک مدعی حمایت دین شطرنج کھیل رہے تھے کسی نے دیکھ کے کہا میاں تم تو صدر ہو خلافت کمیٹی کے۔ تمہیں کیا ہوا جو شطرنج کھیل رہے ہو۔ کہنے لگے میاں اس خلافت کمیٹی کی ہی وجہ سے ڈاڑھی رکھ لی۔ نماز پڑھنا شروع کر دی۔ اب کہتے ہو شطرنج بھی نہ کھیلو تو گویا بالکل ہی بندھ جاؤ سلام ہے ایسی خلافت کمیٹی کو۔ تو جیسی ہماری دیانت ویسی ہی ہمارے کام میں برکت۔ میں سچ کہتا ہوں اگر ہمارا اسلام واقعی اسلام ہوتا تو کفار ہماری صورت دیکھ دیکھ کے مسلمان ہوا کرتے۔ جیسے ہمارے بزرگوں کے وقت میں ہوا کرتا تھا۔ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنی زرہ ایک یہودی کے ہاتھ میں دیکھی۔ فرمایا کہ یہ میری زرہ ہے۔ اُسنے کہا میری ہے۔ دونوں میں حجت بڑھ گئی۔ اُس وقت حضرت شریح قاضی تھے۔ جو حضرت علی کے بالکل محکوم و ماتحت تھے اور پھر یوں بھی تابعی تھے۔ صحابی کے رتبہ کے نہ تھے۔ حضرت علی اُن کے اجلاس میں مستغیث ہوکر پہونچے۔ تو اب فرمائے کہ حضرت علی دعویٰ کریں۔ تو کون کہہ سکتا ہے کہ دلیل و حجت لاؤ۔ مگر شریح پوچھتے ہیں اُس یہودی سے کہ کیا حضرت علی کا دعویٰ ٹھیک ہے۔ اُسنے کہا نہیں۔ حضرت علی سے کہتے ہیں کہ آپ کا کوئی گواہ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ایک صاحبزادہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اور ایک غلام قنبر جنہیں آپ آزاد کر چکے تھے حضرت علی کا یہ مذہب تھا کہ باپ کے حق میں بیٹے کی شہادت معتبر ہے۔ اسلئے حسن رض کو پیش کیا۔ مگر شریح کا یہ مذہب نہ تھا اسلئے اونکے نزدیک نصاب شہادت پورا نہ تھا۔

مناسبت ہوگی۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ پرانی نسل پر بھی معتدبہ درجہ میں اسکا اچھا اثر پڑیگا۔
چنانچہ یہاں بھی یتیم خانہ میں دعوۃ حلقیہ کا انتظام کیا گیا ہے۔ اور جب تک کوئی مستقل تحویلدار
مشورہ سے معین ہو اسکے متعلق تمام چندہ ڈاکٹر عبدالصمد صاحب کو دینا چاہیئے۔ اور چونکہ
وہ ہر وقت نہیں ملتے اسلئے اُنھوں نے یتیم خانہ میں اپنے معتبر نائب مقرر کردئے ہیں وہ روپیہ
لیکے رسید دینگے۔ اور دینے میں قلیل وکثیر کا خیال نہیں ہونا چاہیئے جو ہوسکے وہ دو۔ خواہ روپیہ
ہو خواہ پیسہ۔ بہرحال کچھ بھی ہو عند اللہ اوسکی بھی بڑی وقعت ہے اب سوال پیدا ہوتا ہے
کہ ایک جماعت ایسی بھی تو ہے جسکے پاس نہ علم ہے نہ مال پھر وہ کیسے اس دعوۃ میں حصہ لے
اسکا جواب یہ ہے سہ

لاخیل عندک تہدیھا ولا مال فلیسعد النطق ان لم یسعد الحال

یعنی اگر علم اور مال نہیں ہے تو خالی زبان تو ہے۔ اوس سے کام کرو باقی یہ کہ زبان سے کیا کام کریں
تو زبان سے دعا کیا کرو۔ کہ اے اللہ اسلام کو عزت دیجئے اے اللہ اسلام کی نصرت کیجئے اور
اے اللہ مسلمانوں کے دین کی حفاظت کیجئے۔ اے اللہ حق کو حق اور باطل کو
باطل ظاہر کردیجئے اور دین کے برکات کو عام اور تام کردیجئے۔ تو بھائی یہ تو ایسی
دعوۃ ہے۔ کہ اس سے تو کوئی بھی نہیں گیا گزرا۔ مگر افسوس بہتوں سے یہ بھی نہیں ہوسکتا
بات کیا ہے کہ دل کو نہیں لگی۔ خلاصہ یہ کہ جب سب ملکے اپنی اپنی خدمت میں لگیں گے
تب انہیں ثمرہ مرتب ہوگا۔ اور اگر بفرض محال ثمرہ نہ بھی مرتب ہو تو تم تو اپنے کام میں لگو جو
تمہارا کام ہے۔ باقی ثمرہ دینا نہ دینا اُن کا کام ہے تمہیں اُس سے کیا۔ اب ایک ضروری
بات قابل بیان ہے۔ وہ یہ کہ ان آیات سے یہ تو سب کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ داعی میں دعوۃ کے
ساتھ عمل صالح اور عمل صالح کے ساتھ تواضع وافتقار بھی ہونا ضرور ہے اب ہم دیکھتے ہیں۔
اور دیکھکر سخت شرم اور افسوس ہوتا ہے۔ کہ اسلامی کام اکثر اُن لوگوں کے ہاتھوں میں
ہیں جن پر عمل صالح تو کیا صادق آتا۔ آمن بھی مشکل سے صادق آتا ہے۔ یعنی مدعی
تو ہیں خدمت اسلام کے اور کفر کے کلمے بکتے ہیں۔ علماء کی تضحیک و توہین کرتے ہیں۔
دین کا استخفاف کرتے ہیں۔ اور پھر اسلام کی خدمت کے مدعی بنتے ہیں، دین کے حامی بنتے ہیں

آپ نے یہی فرمایا کہ لوگوں کی نظر خالد پر پڑنے لگی تھی اللہ کیطرف متوجہ نہ تھے۔ مجھے ڈر ہوا کہ خالد پر نظر کرنے سے کہیں نصرت میں کمی نہ ہو جائے۔ یہ تھا ہمارے اکابر کا مذاق۔ اتو اسقدر دہریت بڑہتی جاتی ہے۔ کہ خدا پر نظر ہی نہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تدبیر نہ کرو۔ ہاں یہ کہتا ہوں کہ تدبیر کو قبلہ و کعبہ نہ بناؤ ؎

عقل در اسباب میدارد نظر　　عشق میگوید مسبب را نگر

تدابیر میں اعتدال ہو افراط نہو۔ القصہ اب حضرت ابو عبیدہ کے پاس پروانہ پہونچا اب ابو عبیدہ مارے شرم کے انکے سامنے جا کر نہیں کہتے کیونکہ اتبک تو انکی ماتحتی میں کام کر رہے تھے۔ اب انکو ماتحت ہونیکے لئے کیسے کہیں اسلئے وہ خط ہی حضرت خالد کے پاس بھیجدیا حضرت خالد خط پڑھکر خود ابو عبیدہ کے پاس آئے اور عرض کیا کہ میں انشاءاللہ آج سے آپ کی اطاعت کرونگا۔ کیونکہ اب آپ ہمارے سردار ہیں۔ اور میں تو اس عزل کو اپنے لئے حق تعالیٰ کی نعمت سمجھتا ہوں کیونکہ اسکے قبل مجھے اپنی جان پیاری تھی۔ کہ اگر میں نہونگا تو یہ خدمت۔ کون کریگا۔ اسلئے بعض خطرات میں پڑنے سے احتیاط کرتا تھا۔ اور اتبو بیفکری ہوگئی اب آپ میرے قتال کی خدمتیں انشاءاللہ تعالیٰ دیکھئے گا اور صاحب اتبو یہ حالت ہے کہ جب تک صدر یا سکریٹری رہے نماز روزہ سب کچھ کرتے رہے اور جب دوسرا صدر ہوگیا تو یہ اپنے شہر کو بھاگ گئے۔ کو نہو د خدمت سے مقصود منصب ہوگیا جو سراسر دین کے لئے اسقدر مضر ہے۔ کہ ایک بزرگ کے ایک مرید تھے۔ ایک عرصہ تک ذکر و شغل کرتے رہے مگر کچھ نفع نہ ہوا۔ ایک دن شیخ سے اپنی حالت عرض کی۔ شیخ نے پوچھا تمہاری نیت اس ذکر و شغل سے کیا ہے کہا نیت یہ ہے کہ کچھ حاصل ہو جاوے گا۔ تو لوگوں کو نفع پہونچاؤ نگا۔ فرمایا توبہ کرو۔ یہ تو شرک ہے۔ جب ہی تو تمکو نفع نہیں ہوا پہلے ہی سے بڑے بننے کی نیت ہے۔ بس نیت یہ رکھو کہ مرتا ہوں۔ مٹتا ہوں۔ اپنی درستی چاہتا ہوں۔ پھر چاہے وہ تمہیں مرشد بنادیں چاہے نہ بنادیں۔ تو مبصرین کے نزدیک یہ نیت بھی مضر ہے۔ کہ لوگوں کی اصلاح کرونگا۔ جب دین کی نیت سے بھی بڑائی ناپسند ہے تو دنیا کے کاموں میں تو بڑائی کا ارادہ کب پسندیدہ ہوگا۔ تو خلاصہ یہ

اس وجہ سے مقدمہ خارج کر دیا۔ حضرت علی نہایت بشاش اجلاس سے باہر چلے آئے
اُس یہودی نے جو یہ رنگ دیکھا تو اُس پر بڑا اثر ہوا۔ اُسنے کہا کہ اول تو یہ بادشاہ
صاحب اختیار اگر چاہتے تو مجھسے چھین لیتے اور جوتیاں بھی لگاتے مگر نہیں۔ ضابطہ کی موافق
قاضی کے یہاں جاتے ہیں۔ جو اُنکا محکوم ہے اور پھر وہ آپکی شہادت کو رد کرکے مقدمہ خارج
کر دیتا ہے۔ اور یہ ذرا بھی چیں بجبیں نہیں ہوتے۔ ضرور یہ مذہب حق ہی۔ فوراً زرہ کا
اقرار کر لیا اور فوراً ہی تشہد پڑھ مسلمان ہو گیا اور آپ کے ہاتھ پر بیعت ہو کر آپکے
ساتھ جنگ صفین میں شریک ہوا۔ اور وہیں شہید ہوا۔ تو اتنا بڑا دشمن اسلام ذرا سی
بات میں مسلمان ہو گیا۔ تو بات کیا تھی۔ فقط حضرت علی کے اخلاق کو دیکھ کر اُس پر اثر ہوا
اسی طرح اگر ہم بھی پکے مسلمان ہو جائیں۔ تو بہت سے سلیم الطبع کافر ہم کو دیکھ دیکھ کی
مسلمان ہو جائیں۔ تو عمل صالحاً کی اسلئے ضرورت ہے۔ پس جنکے ہاتھ میں دین کی
خدمتیں ہیں اُنہیں ضرور متقی بننا چاہیئے۔ شاید متقی کی حقیقت کوئی نہ سمجھے تو میں مختصر
کیوں نہ کہدوں کہ عمل کے اعتبار سے ملا بننا چاہیئے۔ پھر ملا بن کر بھی جو ایک کوتاہی یہ
ہوتی ہے۔ کہ اپنی خدمت پر فخر کرتے ہیں۔ یہ بھی نہ ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ اننی من المسلمین سے
معلوم ہو گیا۔ کہ سب کام خدا ہی کی توفیق سے ہوتا ہے۔ اپنے اوپر ذرا نظر نہ کرنی چاہیئے
خدا ہی پر نظر رکھنی چاہیئے۔ تو گویا ملا کے ساتھ صوفی بھی بننا چاہیئے۔ دیکھئے امیر المؤمنین
حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت خالد کو اُس حالت میں سرداری سے معزول
کیا ہے۔ جبکہ وہ کفار کے مقابلہ میں ملک شام میں دمشق کا محاصرہ کئے ہوئے ہیں جس کی
دو وجہ تھیں ایک تو حضرت خالد کی بعض سخاوتوں کو وہ بے موقع سمجھتے تھے دوسرے
یہ فرماتے تھے۔ کہ لوگوں کو حضرت خالد پر زیادہ نظر ہو گئی ہے۔ خدا پر نظر کم ہو گئی یہ ٹھیک
نہیں غرض شام میں ابو عبیدہ کے پاس پروانہ بھیجا۔ کہ میں نے خالد کو معزول کیا۔ اور
اُن کی جگہ تم کو مقرر کیا۔ یہ نرے عابد زاہد بزرگ تھے۔ نہ آداب جنگ کا خالد کی برابر
تجربہ رکھتے تھے۔ اور نہ اونکی برابر قواعد جنگ سے واقف تھے۔ اور خالد سیف اللہ اور
بڑے مشہور شجاع اور ماہر جنگ تھے۔ لوگوں نے آپسے پوچھا بھی۔ کہ حضرت یہ کیا کیا

تو دشمن دوست بن جاویگا۔ اور پھر وہ اگر تمہیں مدد نہ بھی دیگا۔ تو تمہاری کوششوں کو روکے گا بھی نہیں۔ اور دعوت الی اللہ کا کام مکمل ہوگا۔ یہاں اس کے متعلق ایک شبہ ہے۔ کہ ہم بعض جگہ دیکھتے ہیں۔ کہ باوجود اس رعایت کے بھی وہ دوست نہیں بنتا۔ بلکہ اپنے شر اور فساد میں اسی طرح سرگرم رہتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں بقاعدہ عقلیہ ایک شرط ملحوظ ہے وہ یہ کہ بشرط سلامۃ الطبع کہ وہ شر سے اس وقت باز رہیگا۔ جبکہ سلیم الطبع ہو۔ اور اگر سلامت طبع کی قید نہ ہو تو اس وقت یہ جواب ہے کہ ولی حمیم نہیں فرمایا بلکہ کانہ ولی حمیم فرمایا ہے تشبیہ کا حاصل یہ ہوگا۔ کہ کچھ نہ کچھ شر ہی میں کمی رہے گی۔ اور اگر تم انتقام لوگے تو گو اسوقت وہ عدم قدرت کی وجہ سے خاموش ہو جاوے۔ مگر درپردہ کینہ مضمر رکھیگا۔ اور حتی الامکان لوگوں سے تمہارے خلاف سازش کرے گا۔ جس کو غلطی سے آدمی کبھی یوں سمجھ جاتا ہے۔ کہ انتقام اصلح ہوا۔ تو ایک ادب یہ بتایا تبلیغ کا کہ صبر وضبط سے کام لیا جاوے۔ اور جو ناگوار امور مخالفین کی طرف سے پیش آویں انہیں برداشت کیا جاوے۔ اور یہ مدافعت سئیہ بالحسنۃ چونکہ کام تھا نہایت مشکل اسلیئے اس کی ترغیب کے لئے فرماتے ہیں۔ وما یلقاھا الا الذین صبروا وما یلقاھا الا ذو حظ عظیم۔ اور یہ بات انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ جو بڑے مستقل ہیں۔ اور یہ بات اسکو نصیب ہوتی ہے۔ جو بڑا صاحب نصیب ہے۔ تو اس مدافعت کی ترغیب دو وجہ سے دلائی گئی ہے۔ ایک باعتبار اخلاق کے کہ ایسا کرنے میں صابرین میں شمار ہوگا۔ اور ایک باعتبار اجر و ثواب کے کہ ایسا کروگے۔ تو اجر عظیم کے مستحق ہو جاؤ گے۔ اب اس میں ایک مانع بھی تھا۔ یعنی دشمن شیطان جو ہر وقت لگا ہوا ہے اس کا بھی علاج بتلاتے ہیں۔ واما ینزغنک من الشیطن نزغ فاستعذ باللہ۔ اگر آپ کو شیطان کی طرف سے وسوسہ آوے۔ تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے۔ یعنی بعض اوقات مخالفین کی باتوں پر شیاطین غصہ دلاتے ہیں

کہ دعوۃ الی اللہ کے ساتھ عمل صالح بھی ہو اور تواضع و انکسار بھی ہو۔ چونکہ فتنہ ارتداد کے سبب اس وقت بھی اس مضمون کی خاص ضرورت تھی۔ اور آئندہ بھی عام ضرورت ہے۔ اسلئے تفصیل سے اس کو بیان کر دیا۔ اب آگے بقیہ آیات کا ترجمہ بھی بیان کئے دیتا ہوں۔ ولا تستوی الحسنۃ ولا السیئۃ یعنی اچھائی اور برائی برابر نہیں ہے۔ یہاں سوال ہوتا ہے کہ اوپر تو دعوۃ الی اللہ کا ذکر تھا۔ یہاں یہ بیان ہے۔ کہ نیکی بدی برابر نہیں ہے۔ آخر اس جملہ کو سیاق و سباق سے کیا مناسبت آگے ارشاد ہے ادفع بالتی ھی احسن یعنی مدافعت کیجئے اس طریقے سے جو اچھا ہو۔ یہ بھی بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس میں اخلاق کی تعلیم ہو رہی ہے۔ جواب یہ ہے۔ کہ اصل تعلق تو دعوت الی اللہ کے معمول سے ادفع بالتی ھی احسن کا ہی اس طرح سے کہ جو شخص دعوۃ کے لئے کھڑا ہوتا ہے۔ عموماً اُس کی مخالفت ہوتی ہے لوگ بُرا بھلا کہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اُس وقت اس میں بھی ہیجان پیدا ہو۔ اور یہ بھی بدی کے بدلے بدی کر بیٹھے۔ اسلئے ایسے واقعات کے پیش آنے سے پہلے ہی تعلیم فرماتے ہیں کہ اخلاق درست کرو۔ اپنے میں ضبط اور صبر پیدا کرو یہ معنی ہوئے ادفع بالتی ھی احسن کے یعنی ادفع السیئۃ بالحسنۃ۔ کہ کوئی برائی کرے تو اُسے نیکی کر کے دفع کر دو۔ پس اصل تعلق تو جملہ ادفع کا ہے باقی لا تستوی الحسنۃ الخ یہ اُس کی تمہید ہے یعنی بتلانا تو مقصود ہے۔ ادفع بالتی الخ کا۔ مگر تمہید میں پہلے ایک قاعدہ کلیہ بتاتے ہیں کہ دیکھو نیکی اور بدی اثر میں برابر نہیں ہوتی۔ یعنی اگر برائی کا انتقام برائی سے لیا تو اُس کا اثر اور ہو گا۔ اور اگر ٹال دیا تو اُس کا اثر اور ہو گا۔ اور وہ اثر یہ ہو گا۔ کہ فاذا الذی بینک و بینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم۔ جس شخص کے اور تمہارے درمیان میں عداوت تھی۔ وہ ایسا ہو جائے گا جیسے گاڑھا دوست۔ مطلب یہ کہ دعوۃ الی الاسلام کے لئے اس کی بھی ضرورت ہے۔ کہ مخالفین بھڑکیں نہیں۔ کیونکہ اگر بھڑکیگا تو اُس کا شر اور بڑھیگا۔ پہلے چھپی ہوئی عداوت کرتا تھا تو اب کھلی ہوئی کریگا تو اس عداوت سے اور شر سے بچنے کی تدبیر یہ ہے۔ کہ ٹالدو اور انتقام لینے کی فکر نکرو

اور اُس وقت صبر کے چھوٹ جانے کا اندیشہ ہے تو ایسے وقت کے لئے فرماتے ہیں کہ فاستعذ باللہ خدا کی پناہ میں چلے جاؤ۔ یہ مطلب نہیں کہ صرف زبان سے اعوذ باللہ پڑھ لیا کرو۔ مطلب یہ ہے۔ کہ خدا سے دل سے دعا کرو۔ کہ وہ شیطان کے وسوسہ کو دور کر دے۔ اور صبر پر استقامت دے۔ انہ ھو السمیع العلیم ط بلاشبہہ وہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے۔ یعنی وہ تمہاری زبان سے پناہ مانگنے کو بھی سُنینگے۔ اور دل سے پناہ مانگنے کو بھی جانینگے۔ اور پھر تم کو پناہ دینگے۔ اور مدد کرینگے۔ اور شیطان کو دفع کر دینگے۔ ان آیات میں حق تعالیٰ نے پورے پورے آداب اور مکملات دعوۃ الی اللہ کے۔ اور اس کے طریقے سب بتا دئے۔ یہ ہے حاصل اس بیان کا۔ یہ چونکہ ضروری مضمون تھا۔ اس لئے میں نے بقدر ضرورت تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔ اب حق تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ ہمکو اسکے سمجھنے کی اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین فقط۔